رضی الدین صدیقی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اُردو شمارہ (۱۰۶)

تعلیم کا مسئلہ

از

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی

پروفیسر ریاضی جامعۂ عثمانیہ
حیدرآباد دکن

ناشر

قیمت عہ   سب رس کتاب گھر۔ خیرت آباد حیدرآباد دکن   ۱۹۴۳ء

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس

فہرست

صفحہ

دیباچہ ۵
۱) تعلیم و تربیت کا مقصد ۹
۲) تعلیم کی مدت ۱۱
۳) موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص ۱۴
ا) افادیت کا غلط نصب العین "
ب) اساتذہ کے درسوں کے مقصد کی غلط تعیین۔ ۱۶
ج) محدود تخصیص ۱۷
۴) اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین ۲۳
۵) علم کی وحدت ۲۸
۶) انسانی وحدت کی تعلیم ۳۸

۷) ایمان اور علم ۴۴
۸) ابتدائی اور ثانوی تعلیم ۴۷
۹) اعلیٰ تعلیم ۵۸
۱۰) تعلیمی منزلیں اور نصاب ۷۰
ا) ابتدائی (پرائمری تعلیم) ۷۰
ب) ثانوی (سکنڈری) تعلیم ۷۶
ج) اعلیٰ تعلیم ۸۱
۱۱) جامعہ کے شعبہ جات ۸۵
۱۲) طالب علم اور علمی سیاسیات ۸۸

دیباچہ

گذشتہ دس بارہ سال کے عرصہ میں میں نے ہندوستان کے مختلف مقامات پر تقریر کرتے ہوئے تعلیم کے بعض مسئلوں سے بحث کی ہے اور یہ تقریریں ملک کے مختلف رسالوں میں وقتاً بوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں۔ آج کل سرکاری اور پبلک اداروں کی طرف سے تعلیم و تربیت کی فوری ضروریات اور جنگ کے بعد ان کی تنظیم و اصلاح کے متعلق غور کرنے کے لئے مختلف کمیٹیاں مقرر ہو رہی ہیں۔ خود مجھے بھی بعض ایسی کمیٹیوں میں اپنی رائے دینی پڑتی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان متفرق تقریروں کے متعلقہ اجزا کو موزوں ترتیب دے کر مسلسل اور مربوط شکل میں پیش کیا جائے تاکہ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے اہم مسئلوں کے متعلق میرے خیالات واضح ہو جائیں۔

تعلیم کے متعلق جو خاکہ میں یہاں پیش کر رہا ہوں اس کا ماحصل وہ تجویزیں ہیں جو صفحات ۹ تا ۹۶ پر ابتدائی منزل سے لے کر جامعاتی منزل تک مضامین، نصاب تعلیم اور مدت تعلیم وغیرہ کی شکل میں درج کی گئی ہیں۔ اس نصاب تعلیم کو قابل عمل اور قرین قیاس ثابت کرنے کے لئے میں نے ابتدا میں مختلف اصولی امور سے مختصر بحث کی ہے۔

شروع میں میں نے فرد اور جماعت کے فرائض اور حقوق کے متعلق چند بنیادی اصول مان لئے ہیں اور پھر ان کی بنا پر بعد میں نصاب تعلیم وغیرہ کے متعلق چند نتیجے کم و بیش منطقی لزوم کے تحت اخذ کئے ہیں۔ اگر شبہ اور انکار کی گنجائش ہے تو انہی ابتدائی مفروضوں کے متعلق ہے، ایک مرتبہ انھیں تسلیم کر لینے کے بعد ان کے نتیجوں سے انکار کرنا غالباً ممکن نہیں۔

تعلیم کے متعلق میری ان تجویزوں کا تعلق کسی خاص طبقہ یا جماعت سے نہیں ہے بلکہ میری دانست میں یہ تجویزیں تقریباً تمام جماعتوں کے لئے قابل عمل ہیں۔ مثال کے طور پر اور مضمون

کی تشکیل میں سہولت کی خاطر میں نے جا بجا اردو داں طبقہ اور مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق تفصیلی تجویزیں پیش کی ہیں۔ ان مقامات پر اگر لفظ اردو کی بجائے لفظ مادری زبان کا اندراج کر دیا جائے تو یہی تجویزیں ان لوگوں کے لئے بھی کارآمد ہو سکتی ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں میں نے مسلمانوں کے متعلق دینیات کا نصاب پیش کیا ہے وہاں دوسرے مذہب کے پیرو اپنی مذہبی معلومات کا نصاب درج کر سکتے ہیں۔

زبان کے متعلق میرا خیال ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے انھیں یہ زبان بطور دوسری زبان کے سیکھنی چاہئے تاکہ کم از کم آئندہ نسلوں کے لئے اردو بطور عام زبان (Lingua Franca) کے ملک کے طول و عرض میں رائج ہو جائے۔

ہندوستان میں ابھی بہت سے مکتب اور ادارے "علوم مشرقیہ" کے پائے جاتے ہیں جن میں خاص زبانوں مثلاً عربی، فارسی، یا سنسکرت اور ہندی وغیرہ کی تعلیم کو مخصوص کیا جاتا ہے اور ان زبانوں کی مدد سے مذہب کے متعلقہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم دیکھیں گے کہ علوم کی تقسیم اور بہت سے طریقوں سے کی جاتی ہے لیکن میری رائے میں مشرق و مغرب یا شمال و جنوب کی سمتوں کے لحاظ سے علوم کو تقسیم کرنے میں کوئی خاص موزونیت یا خوبی نہیں ہے۔ کوئی علم کسی خاص خطہ یا قوم کی میراث نہیں ہو سکتا اور اس کی حیثیت ساری دنیا کے لئے ایک ہی ہونی چاہئے۔

میں نے ابتدا ہی میں اس امر کو بطور بنیادی مفروضہ کے مان لیا ہے کہ تعلیم کا مقصد فرد کی زندگی کے جسمانی، ذہنی اور روحانی تینوں پہلوؤں کو استوار کرنا اور فروغ دینا ہے اور اس کے علاوہ فرد کو اجتماعی زندگی میں حصہ لینے اور جماعت کی کچھ نہ کچھ خدمت کر سکنے کے قابل بنانا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا جو معیار اور نصاب اس مضمون میں تجویز کیا گیا ہے اور جو ساری تعلیم و تربیت کی اصل بنیاد ہے وہ ان ضروری اجزاء کو پیش نظر رکھ کر معین کیا گیا ہے۔ اب کوئی فرد چاہے "علوم شرقی" سیکھے یا "علوم مغربی" اس کے لئے ہمارے مجوزہ ابتدائی اور

ثانوی منزلوں کے نصاب کی تکمیل لازمی ہے۔ زیادہ سے زیادہ۔ کیا جاسکتا ہے کہ مشرقی تعلیم حاصل کرنے والے کو انگریزی یا کسی اور غیر زبان کے سیکھنے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اس ثانوی منزل کو ختم کرنے کے بعد یہ افراد دینی علوم یا کسی زبان و ادب میں تخصص کر سکتے ہیں اور ان میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں لیکن ان مکتبوں میں تعلیم کو محض زبان اور مذہبی علوم تک محدود کر دینے اور دوسرے طبیعی، حیاتی اور عمرانی علوم کو یک لخت نظر انداز کر دینے سے ان افراد کی تعلیم بالکل ناقص رہ جاتی ہے اور وہ دین و دنیا دونوں میں سے کسی ایک کی بھی صحیح خدمت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ مقتدیان دین اور علمائے مذہب کے رتبے بلند ہوتے ہیں اس لئے اگر انھیں محنت بھی اسی تناسب سے زیادہ کرنی پڑے اور مشکلیں بھی زیادہ برداشت کرنی پڑیں تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ جو لوگ جماعت کے رہنما ہونے کی خواہش رکھتے ہوں انھیں علم اور عمل دونوں میں جماعت کے باقی تمام افراد سے بہتر ہونا چاہیے پھر جیسا کہ میں کچھ کہہ چکا ہوں علم کی کوئی تقسیم مشرقی و مغربی یا مذہبی پیمانوں سے نہیں کی جاسکتی۔ "الحکمۃ ضالۃ المومن" تمام علم و حکمت مرد مومن کی گم شدہ میراث ہے اور علماء دین کو دینی علوم میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ دوسرے علوم و فنون سے بھی بہرہ ور ہونا چاہیے۔

آج کل کثیر اصلاحوں اور تنظیموں کو بعد جنگ کے لئے اٹھا رکھنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے لیکن فوجی دفاع کی طرح تعلیم کا مسئلہ بھی ایسا ہے کہ جس میں کوئی تاخیر روا نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ مسئلہ ابھی اور اسی وقت حل ہونا چاہیے اور تعلیم کی صحیح تشکیل دی جانی چاہیے تاکہ جنگ کے ختم تک ایک ایسی نسل تیار ہو جائے جو دنیا کے کاروبار صحیح طریقے پر چلا سکے ورنہ جنگ کے زمانے سے زیادہ جنگ کے بعد خطرات لاحق ہونے کا اندیشہ ہے اور حقیقت میں دیکھا جائے تو جو تجویزیں اس مضمون میں پیش کی جارہی ہیں ان میں یا ان کے مماثل کسی دوسری تجویزوں میں کوئی تجویز ایسی نہیں ہے جس کو ابھی اور اسی وقت بروئے عمل نہ لایا جاسکتا ہو۔ تاخیر اور التواء صرف اس کام میں کیا جاسکتا ہے جس کے لئے یورپ یا امریکہ سے کسی مشینری کا منگوانا ناگزیر ہو

یا جس کے لئے غیر معمولی زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہو۔ جو کام معمولی اخراجات میں اور ایسے سازوسامان کے ساتھ کیے جا سکتے ہوں جو ملک میں اس وقت مہیا کیا جا سکتا ہے انھیں بعد جنگ پر انحصار رکھنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

تعلیم کا مسئلہ سیاسی اور اقتصادی مسئلوں سے آزاد حیثیت رکھتا ہے۔ جہالت اور لاعلمی نہ صرف افراد کے لئے بلکہ جماعت کے لیے بھی اسی طرح مضر اور خطرناک ہیں جیسے بیرونی دشمن، اور جہالت کو دفع کرنے کے لئے بھی تقریباً وہی طریقے اختیار کرنے چاہئیں جو بیرونی حملہ آوروں سے مدافعت اور حفاظت کے لئے اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے لئے فوری اور طویل میعادی ہر دو قسم کے نظام عمل تیار کرنے اور انھیں شروع کر دینے کی سخت ضرورت ہے۔

گذشتہ جنگ عظیم کے دوران میں انگلستان کے ایک فوجی افسر نے وہاں کے ایک پروفیسر سے دریافت کیا کہ ہم تو تہذیب و تمدن کی خاطر اپنی جانیں لڑا رہے ہیں لیکن آپ اس کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے جواب دیا کہ ہم ہی تو وہ تہذیب و تمدن ہیں جس کی خاطر آپ اپنی جانیں لڑا رہے ہیں۔ اس بظاہر دلچسپ لطیفے میں ایک گہری حقیقت بھی پنہاں ہے۔ بدی کی قوتوں پر غالب آنے اور بیرونی حملہ آوروں سے حفاظت اور مدافعت کی خاطر جتنی بھی جان توڑ کوشش کی جائے یقیناً کم ہے لیکن اس کے ساتھ اس نکتے کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ جنگ کی اصلی غرض و غایت محض جان و مال کی حفاظت نہیں بلکہ ان اعلیٰ اقدار کی حفاظت ہے جو زندگی کو واقعی قابل زیست بناتی ہیں۔ انہی اقدار میں بلند درجہ علم و فن کا بھی ہے اور اس مختصر مضمون کا مقصد یہی ہے کہ علم و فن کی صحیح تنظیم و تشکیل کی جانب توجہ دلائی جائے۔

رضی الدین صدیقی

۱۔ تعلیم و تربیت کا مقصد

ہر فرد کی زندگی کے دو بڑے پہلو ہوتے ہیں، انفرادی اور اجتماعی۔ پھر انفرادی زندگی بھی تین ذیلی شعبوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے یعنی جسمانی ذہنی اور روحانی زندگی۔ تعلیم و تربیت کا منشا اور مقصود یہ ہونا چاہئے کہ وہ فرد کی زندگی کے ان مختلف پہلوؤں کے نشو و نما اور ترقی میں مدد دے اور کسی ایک پہلو کو بھی نظر انداز نہ کرے۔ اس لیے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت میں ورزش اور کھیل کود کے ساتھ عقلی اور ذہنی علوم اور مذہب و دینیات کی تعلیم کا صحیح تناسب میں انتظام ہونا چاہیے تاکہ انفرادی زندگی کے تینوں پہلو ایک ساتھ نشو و نما پائیں۔ اگر کسی فرد کی زندگی میں ایک پہلو بھی حد سے زیادہ کمزور رہ جائے تو اس کی زندگی مکمل اور خوشگوار نہیں کہلائی جا سکتی۔

اس لئے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ زندگی کے ان مختلف شعبوں میں سے ہر شعبہ کی حد تک تربیت حاصل کرے کہ وہ شعبہ نشو و نما کے ایک قلیل ترین (Minimum) معیاری درجہ تک پہنچ جائے اور آیندہ زندگی میں مفید ہو سکے۔ جسم کو اس حد تک مضبوط بنانا چاہیے کہ عمر صحت اور تندرستی کے ساتھ گذر سکے، اعضا زندگی کی کشمکش میں ساتھ دیں اور معمولی امراض کا بخوبی مقابلہ کر سکیں۔ ذہن کی تربیت اس قدر ہونی چاہئے کہ تہذیب اور تمدن کے بنیادی اصول اور اساسی مسائل سے واقفیت کے

علاوہ ایک خاص علم یا فن یا پیشہ میں کافی مہارت اور کمال حاصل ہو جائے تاکہ فرد اپنی جماعت اور نوع انسان کی کچھ خدمت کر سکے اور اس کا وجود اجتماعی حیثیت سے محض بے کار نہ ہو۔ روح کی تربیت اس حد تک ہونی چاہیئے کہ انسان کو دلی اطمینان اور مسرت حاصل ہو اور زندگی بے کیف اور بے مقصد محسوس نہ ہونے لگے۔ ان تینوں قسموں کی تربیت کے بعد فرد کی زندگی ایک حد تک تکمیل کی طرف آگے بڑھتی ہے کیونکہ اسی وقت وہ زندگی کے تمام لوازمات سے مناسب ترین فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اس انفرادی زندگی سے آگے زندگی کی ایک اور منزل ہوتی ہے جو فرد سے انتہائی توجہ اور محنت و مشقت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس منزل پر فرد کا وجود صرف اس کی اپنی ذات کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ جماعت کا بھی رکن ہوتا ہے اور اس پر اجتماعی ربط اور تعلق کی وجہ سے نئے اور اہم تر فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اب اس کو بتدریج عزیز و اقارب، دوست احباب، ملک و قوم اور آخر کار دنیا اور نوع انسان سے سابقہ پڑتا ہے اور ان سب کے حقوق ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے تعلیم و تربیت کا مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ فرد کو ان تمام فرائض کے بطریق احسن انجام دینے کے قابل بنایا جائے۔

۲۔ تعلیم کی مدّت

اس زمانے میں انسانی عمر کا اوسط عام طور پر پچاس ساٹھ برس فرض کیا جا سکتا ہے
زندگی کے مذکورۂ بالا مختلف پہلوؤں کی نشوونما کے لیے اعلیٰ تعلیم و تربیت کی خاطر
نصف عمر یعنی پچیس تیس برس صرف کرنا کچھ نامناسب نہیں۔ ہر علم و فن گذشتہ پچاس
سال میں اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ اس کے مبادیات پر حاوی ہونے کی خاطر
بھی اب پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ وقت درکار ہے۔ اس کے علاوہ متمدن
زندگی اب پہلے کی طرح سادہ نہیں رہی بلکہ بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہے اور
زندگی کے ہر معمولی شعبہ اور کاروبار میں ناتربیت یافتہ / نیم تربیت یافتہ لوگوں سے
کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے لئے اچھے ماہرین کی ضرورت ہے۔ اس لئے کوئی تعجب
نہ ہونا چاہئے اگر علم و فن کی موجودہ وسعت کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم یہ سفارش کریں
کہ ہر فرد کو اپنے منتخبہ شعبہ میں مہارت حاصل کرنے کی خاطر کم و بیش پچیس سال کی عمر
تک تعلیم اور تربیت پانی چاہئے۔

اس کے علاوہ سب کو معلوم ہے کہ انسانوں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے
لیکن ہمارے معاشرے کی موجودہ تنظیم کی وجہ سے ذرائع معاش اور وسائل روزگار
میں متناسب اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے ہر نفر طلب جائداد اور ملازمت
پر امیدواروں کا ہجوم رہتا ہے۔ اور بے کاروں اور بے روزگاروں کی تعداد
روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اگر ان نوجوانوں کو تعلیم گاہوں اور تربیت گاہوں
میں چند سال اور زیادہ رکھا جائے تو اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ وہ

اپنے خاص علم وفن کے متعلق بہتر معلومات حاصل کریں گے اور زیادہ مہارت پیدا کریں گے بلکہ ملازمتوں پر ہجوم بھی کم ہو جائے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح تعلیم کو عام کرنے سے تعلیم یافتوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ بے روزگاری میں اضافہ ہو گا۔ جو لوگ تعلیم کو بے روزگاری کا سبب بتاتے ہیں وہ اس کا خیال نہیں رکھتے کہ اس کا اصلی سبب آبادی کی زیادتی اور معاشرہ کی ناقص تنظیم ہے نہ کہ تعلیم کی زیادتی۔ تعلیم کی کمی بیشی سے بے روزگاری پر صرف اسی قدر اثر پڑ سکتا ہے کہ اس کا مرکز منتقل ایک مقام سے ہٹ کر دوسرے مقام پر آجائے۔ انسان اگر پیدا ہوا ہے تو اسے بہرحال اپنی زندگی کے دن پورے ہونے تک کھانے کپڑے کی تلاش کرنی ہے۔ تعلیم سے اس جستجو میں اس کو مدد ہی مل سکتی ہے، نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

چند لوگوں کو اندیشہ ہے کہ اگر جامعات اسی رفتار سے گراجویٹ نکالنے لگیں تو غریب اور مزدور طبقہ پیشے کی اولاد بھی گراجویٹ ہو جائے گی اور پھر ادنیٰ درجے کے کام کرنے کے لئے کوئی آمادہ نہیں ہو گا۔ اس کا ایک سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ طیلسانی یا گراجویٹ ہونے کا ٹھیکہ کچھ امیروں اور عہدہ داروں کی اولاد نے تو نہیں لے رکھا ہے کہ غریب مزدوروں کی اولاد طیلسانی نہ ہونے پائے۔ یوں بھی اگر ایک غریب مزدور تعلیم یافتہ ہو گا تو بے کاری کے وقت بجائے لہو ولعب میں مشغول ہونے کے کوئی اخبار یا کتاب ہی پڑھتا رہے گا۔ اب رہا ان کاموں کو انجام دینے کا سوال جن کو عام طور پر ذرد حقیر "پیشوں سے متعلق سمجھا جاتا ہے تو معاشرے میں ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں کہ لوگ

ان کاموں کو انجام دینے کے لئے خود بخود اپنی رضامندی سے آمادہ ہوں۔
کسی فرد بشر کو محض اس بناء پر "حقیر" پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا کہ اس کے آباؤ اجداد بھی اس پیشے سے تعلق رکھتے تھے اس بیسویں صدی میں تمدنی زندگی کا کوئی صحیح اصول نہیں ہو سکتا۔ تمام انسانوں کو مساوی موقع اور مساوی آزادی ہونی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں اور اپنی خواہش اور دلچسپی کا پیشہ اختیار کریں۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ تعلیم کی عام اشاعت سے قبل ملک کی مالی اور اقتصادی حالت کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ اس کے متعلق میں آیندہ صفحات میں تفصیل سے بحث کروں گا۔ یہاں میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ابھی موجودہ حالات کے تحت بھی ہم ہندوستان میں تعلیم کو بہت زیادہ عام کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تعلیم ہماری قومی زندگی کا سب سے زیادہ اہم شعبہ ہے اور ہماری آمدنی کا سب سے بڑا حصہ اسی پر خرچ ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ان اخراجات کو کم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے جو مقابلتہً کم ضروری اور کم اہم ہیں اس کے علاوہ اگر تعلیمی اداروں کی تنظیم صحیح اصول پر کی جائے تو اسی رقم سے جو تعلیمات کے لئے مختص کر دی جاتی ہے طلبہ کی بہت زیادہ تعداد کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔

۳۔ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص

(۱) افادیت کا غلط نصب العین

موجودہ نظام تعلیم کا ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں "افادیت" پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے یعنی ساری کوششیں اس نقطہ پر مرکوز رہتی ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے ہر نوجوان کو کسی پیشہ یا ملازمت کے لیے تیار کر دیا جائے چاہے اس نام نہاد تعلیم و تربیت سے اس کی "انسانیت" کی تکمیل ہو یا نہ ہو۔ اعلیٰ جماعتوں اور کالجوں میں تو کجا بالکل ابتدائی اور تحتانی جماعتوں ہی سے کوشش کی جاتی ہے کہ لڑکے کے سامنے ایک خاص پیشہ کا خیال رہے اور سارا تعلیمی نصاب اس پیشے کے گرد گھومتا رہے۔ بعض جدید اسکیموں میں تو یہ انتہا کر دی گئی ہے کہ تعلیم کی ساری بنیاد ہی کسی پیشے پر رکھی گئی ہے جس سے بچوں کے ذہن میں یہ بات جم جاتی ہے کہ انسان کی زندگی میں سب سے اہم پہلو پیٹ کی فکر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا ملک ایک بہت غریب ملک ہے لیکن اقتصادی مشکلات کا یہ حل تو صحیح نہیں ہو سکتا کہ انسانوں کو روزی کمانے والی مشین اور پیٹ کا بندہ بنا دیا جائے۔ ہر کسان کے بچے کو محض کسان اور ہر مزدور کے بچے کو محض مزدور بنا کر بھی کیا ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ اس سائنسی اور صنعتی انقلاب کے زمانے میں دوسری ترقی یافتہ اور ہر دم

ترقی پذیر قوموں کا مقابلہ کر سکیں۔ ایک محدود پیشہ کی ادھوری تعلیم پائے ہوئے نوجوانوں کے لئے کونسا موقع ہے کہ وہ اپنے ذہنی اور روحانی قوی کو نشوونما دے سکیں اور زندگی کی اعلیٰ اقدار سے واقف ہوں۔ کیا انکی میکانی زندگی میں روٹی کی فکر سے نجات پانے کے باوجود شدید بے اطمینانی اور بیزاری نظر نہیں آتی۔ ان کم و بیش کی فکر میں لگے ہوئے پیشہ وروں اور ملازموں سے جنہیں اعلیٰ انسانی مسائل کے متعلق سوچنے کی نہ فرصت ہے اور نہ صلاحیت، کیا امید ہوسکتی ہے کہ وہ قوم اور بنی نوع کی ترقی میں ممد و معاون ہوں گے۔

(ب) اساتذہ کے درسوں کے مقصد کی غلط تعلیمیں

ایک اور غلطی مدرسہ اور کالج کی تعلیم کے مقصد کو سمجھنے میں ہوئی ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ مدرسہ اور کالج کے اوقات۔ درس ہی میں متعلم کے ذہن میں کسی خاص موضوع کے متعلق معلومات کی ایک معینہ مقدار ٹھونس دی جائے اور پھر امتحان گاہ میں اس کی قوت حافظہ کی آزمائش کی جائے۔ طالب علم کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ جو کچھ معلومات حاصل کرنی ہوں وہ اساتذہ کے درسوں ہی میں حاصل کی جائیں۔ اس کے علاوہ اگر کچھ مطالعہ کبھی کبھی گھر پر کیا جاتا ہے تو وہ اسی خاطر ہوتا ہے کہ درسوں میں بتائی ہوئی معلومات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ اس طرح متعلمین میں یہ صلاحیت اور قابلیت ہی نہیں پیدا ہونے پاتی کہ وہ اپنے طور پر نئی معلومات حاصل کر سکیں۔

اس نظام تعلیم کی غلطی اسی قسم کی ہے جیسے کوئی شخص ایک شیشہ گر کی دکان میں شراب لینے کے لئے جائے حالانکہ شیشہ گر تو جام و مینا بناتا ہے جس میں شراب ڈالی جاسکتی ہے۔ مدرسہ اور کالج کی تعلیم کا اصل مقصد ذہن اور صلاحیتوں کی تربیت ہے۔ اگر ان تعلیم گاہوں میں یہ حقیقی مقصد ایک حد تک پورا کر دیا جائے کہ متعلمین میں خود غور و فکر کی قوت نشو و نما پائے تو پھر ان کا فطری ذوق علم کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ اپنے طور پر تحصیل علم کر سکتے ہیں۔ اس لئے مدرسوں اور کالجوں کو صرف شیشہ گری ہی کرنی چاہیئے شراب علم کی کشید کو ختم تعلیم کے بعد ذاتی مطالعہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔

(ج) محدود تخصیص

ایک بڑا نقص موجودہ نظام تعلیم میں یہ ہے کہ بہت قبل از وقت مضامین کی تخصیص شروع کردی جاتی ہے اور یہ تخصیص بھی اس قدر تنگ اور محدود ہوتی ہے کہ نوجوانوں کو اپنے خاص مضمون کے علاوہ دوسرے انسانی علوم سے مطلق واقفیت نہیں ہونے پاتی۔ یہ چونکہ ایک اہم نکتہ ہے اس لئے اس کے متعلق کسی قدر تفصیل سے بحث کرنی پڑے گی۔

انسان کے ذہنی ارتقاء میں ایک منزل وہ تھی کہ ایک ہی شخص مختلف علوم و فنون کا ماہر ہوتا تھا اور ہر علم و فن میں اصولی تحقیقات کرکے اہم اضافہ کرسکتا تھا۔ ایسی جامع الکمالات ہستیاں مشرق اور مغرب کی تاریخ میں بہت سی گزری ہیں۔ اس زمانے میں علم صرف ان چند افراد کا ورثہ تھا جو اپنی فطری صلاحیتوں کے باعث ہر قسم کے حقائق کی کھوج میں لگے رہتے تھے۔ یہ علوم اکثر سینہ بسینہ منتقل ہوتے تھے اور چونکہ ہر علم کا ابھی آغاز تھا اس لئے اس کے متعلق محض ایک ابتدائی بات بھی اچھی خاصی تحقیق تھی۔ نہ تو حمل و نقل کے ذریعے ایسے ترقی یافتہ تھے اور نہ طباعت و اشاعت کے سامان کی اس قدر فراوانی تھی کہ مختلف لوگ ایک دوسرے کی معلومات اور تحقیقات سے استفادہ کرسکتے۔ مشرق میں چند مکتب اور مغرب میں چند اکادمیاں مفکرین کی ایک محدود جماعت کے لیے علم کی تحصیل اور تحقیق کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابھار ہوتی

صدی کے ختم تک بھی ایک فرد کو جامع العلوم ہونے کا موقع باقی تھا۔ اس زمانے کے علما اور مفکرین کی سوانح عمری سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحقیقات اور علمی کارنامے کس قدر وسیع اور مختلف النوع ہوتے تھے۔ لیکن گزشتہ سو ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ سائنس نے ذرائع حمل ونقل میں انقلاب پیدا کر دیا اور زمین کی طنابیں کھنچ گئیں۔ اشاعت وطباعت کے طریقوں میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ تشنگان علم کے لئے مختلف مقاموں کو جاکر اور مختلف کتابوں اور تحریروں کو پڑھ کر جدید ترین معلومات حاصل کرنا ممکن ہو گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سماجی اور معاشی زندگی میں ایک عظیم الشان تغیر ہو گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ علم ایک محدود طبقہ کی میراث نہیں رہا بلکہ سہل الحصول ہو کر عوام میں پھیل گیا۔ آئے دن نئے مدرسوں، کالجوں اور جامعات کی مانگ بڑھنے لگی۔ تحقیقاتی اداروں اور اشاعتوں کی تعداد دن بدن زیادہ ہوتی گئی۔ طبیعی، حیاتی اور عمرانی علوم میں اہم اور گراں قدر اضافے اور انکشافات ہونے لگے۔ اس بیسویں صدی میں تو تحصیل علم اور تحقیق علم کے ذرائع میں حیرت انگیز ترقی ہوئی جو پچاس برس قبل کے انسانوں کے تصور میں بھی نہیں تھی۔ ان تمام ترقیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر علم وفن اپنی ابتدائی حالت سے نکل کر بالکل نئی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور نہ صرف کئی نئے علوم پیدا ہوئے بلکہ ایک ہی علم کی بہت سی نئی شاخیں بن گئیں جو بذات خود ایک مستقل علم کا درجہ رکھتی ہیں۔

اب ایک فرد بشر کے لئے یہ قطعی ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ اسی طرح جامع العلوم اور جامع الکمالات ہو جیسے قرون وسطیٰ کے علما ہوا کرتے تھے۔ اب ہر طرف تخصیص

کا دور دورہ ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اس قسم کی تخصیص ایک حد تک ناگزیر ہے اور کسی کو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اور دوسری اچھی باتوں کی طرح اس امر میں بھی ہم حد اور اعتدال سے تجاوز کر گئے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ علوم و فنون کی اس کثرت میں ہم خود علم اور صداقت کی وحدت کو بھی بھولتے جا رہے ہیں اور سوائے اپنے خاص مضمون کے دوسرے مضامین کو سمجھنے اور ان کے اساسی مفہوموں سے واقف ہونے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ آگے چل کر میں تمام علوم کے باہمی ربط و تعلق اور خود علم کی وحدت سے تفصیلی بحث کروں گا۔

یہ صحیح ہے کہ کسی خاص علم کے متعلق ایک عامی استدلال کی تفصیلوں وغیرہ سے واقفیت نہیں رکھ سکتا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ ہم محض ایک مورخ، ادیب یا ریاضی داں نہیں ہیں بلکہ ایک انسان اور ایک متمدن انسان ہیں اور تعلیم یافتہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو جو باتیں انسانوں کے لئے بحیثیت مجموعی دلچسپی رکھتی ہیں ان سے ہر فرد کو دلچسپی پیدا کرنی چاہئے۔ کوئی علم جس کو بعض انسانوں نے تشکیل دیا ہو بقیہ انسانوں کے لئے بالکل مہمل یا ناقابل اعتنا نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنے حلقۂ افکار کو اس قدر تنگ نہیں کر سکتے کہ ہمیں اپنے پڑوسی کی بات ہی سمجھ میں نہ آسکے۔ اس امر کے اظہار کو میں اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری علمی اور سائنسی کانفرنسوں میں اس محدود تخصیص کا مظاہرہ زیادہ ہوتا جا رہا ہے اور اگر بروقت اس کے خطرہ سے متنبہ نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ ہمارے علمی اداروں میں کوئی شخص کسی دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکے گا۔ ایک مصنف نے اس زمانے کی محدود تخصیص کی تعریف اس طرح کی ہے کہ

"to know more and more about less and less"

(یعنی کم سے کم کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننا)

میں سمجھتا ہوں کہ اس تعریف میں اگر یہ فقرہ بڑھا دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ

"until everything is known about nothing"

(یہاں تک کہ شئے معدوم کے متعلق سب کچھ معلوم کرنا)

اس میں شک نہیں کہ کسی ایک مضمون کو لے کر اس میں مہارت اور کمال حاصل کرنا ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم انسانی افکار کے دوسرے شعبوں سے بالکل آنکھیں بند کرلیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو اکثر لوگ جو صرف ایک خاص موضوع کے سوا کچھ نہیں جانتے اس ایک موضوع میں بھی کوئی غیر معمولی کمال حاصل نہیں کر سکتے اور اس مثل کے مصداق ہوتے ہیں کہ "ندارد کمالے بایں یک فنی" میری رائے میں ایسے شخص سے جو کسی ایک موضوع میں بھی کامل نہیں ہے یعنی (Master of none) ہے وہ شخص بدرجہا بہتر ہے جو مختلف موضوعوں سے کسی قدر واقفیت رکھتا ہے یعنی (Jack of all) ہے اور ایک متمدن انسان کی طرح انسانوں کے مختلف افکار اور خیالات سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے "ہمہ دانی" کی تضحیک تو بہت کی لیکن یہ خیال نہیں کیا کہ اگر ہر شخص واقعی صرف ایک ہی مضمون کے متعلق معلومات حاصل کرے اور باقی تمام دوسری معلومات سے کورا ہو تو انسانوں کی سماجی اور شہری زندگی ناقابل زیست ہو جائے۔ ریاضی داں محض ریاضی دانوں سے گفتگو کریں اور انجینیر محض انجینیروں سے ظاہر ہے کہ انسانی سوسائٹی کے ارتقا کا

یہ کوئی خوش آیند تصور نہیں ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ اس قدیم انگریزی مقولہ کو کسی قدر بدل کر اب یہ اصول مقرر کرنا چاہئے کہ ہر تعلیم یافتہ فرد
(Jack of all and Master of one)
ہو یعنی ہر شخص ایک علم میں مہارت حاصل کرے اور باقی علوم سے دلچسپی لے اور ان سے کافی واقفیت رکھے۔ معاشرہ کی تنظیم اسی اصول کے لحاظ سے ہونی چاہئے اور میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں بھی یہ بات کم و بیش پیدا کی جا سکتی ہے بشرطیکہ ہم کسی قدر وسیع نظر سے کام لینے کی کوشش کریں اور ایک تنگ دائرہ میں اپنے کو محدود نہ کر دیں۔

یہ عذر قابل قبول نہیں کہ ماہرین اور متعلمین کو اپنے مضامین کے متعلق لکھنے پڑھنے سے اتنی مہلت ہی نہیں ملتی کہ وہ کسی دوسرے مضمون کے متعلق کچھ لکھ پڑھ سکیں۔ اول تو ہم اپنی فرصت کے اوقات کو بہت ضائع کرتے ہیں اور پھر کون ایسا فرد بشر ہے جو دن کے ۲۴ گھنٹے اور سال کے ۳۶۵ دن ایک اور صرف ایک ہی مضمون کے متعلق لکھتا پڑھتا رہتا ہے۔ کسی خاص مضمون کا بڑے سے بڑا ماہر بھی یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ ہر لمحہ اور ہر گھنٹہ اس موضوع کے متعلق اہم یا قابل لحاظ انکشافات کرتا رہے۔ خود انسان کا نفس بھی اس قسم کے محدود تصور سے بغاوت کرنے لگتا ہے اور ایک ہی مضمون کے مسلسل مطالعہ سے دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ ایسے اوقات میں جب کہ اپنے پیشہ کی مصروفیتوں سے فرصت ملے یا دل برداشتہ ہو جائے ہم ایک خاص پروگرام کے تحت دوسرے مضامین کے بنیادی اصولوں اور نتیجوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور ان کے متعلق عام دلچسپی کے ساتھ گفتگو اور بحث کرنے کے

قابل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایک معینہ مدت میں علم کے ہر اہم شعبہ کے متعلق ہماری معلومات اس پایہ کی ہو سکتی ہیں جو اس مضمون کے ایک اوسط طیلسانی کو حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین

ایک علم میں مہارت، باقی علوم سے واقفیت

خصوصاً ایک جامعہ سے تعلق رکھنے والے افراد کا یہی مابہ الامتیاز ہونا چاہیئے کہ ایک حد تک ان کی ذات مختلف حیثیتوں سے جامع ہو۔ یہ نو نہ ہو کہ اگر تاریخ یا فلسفہ کی کوئی ابتدائی اور موٹی بات بھی کہی جائے تو سائنس داں اس طرح سرہلائیں گویا کہنے والا کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ہمارے موجودہ نظام تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ وہ متعلمین میں بالکل "یک فنی" ہو کر رہ جانے کا رجحان پیدا کر دیتا ہے اور لبرل ایجوکیشن کے قدیم اور آزمودہ اصول کو پس پشت ڈالتا جا رہا ہے۔

ہر تعلیم یافتہ شخص اور خصوصاً ایک جامعہ کے متعلم کے لئے وسعت نظر لازمی ہے اور کسی خاص مضمون میں بہت محدود تخصیص ایم اے یا زیادہ سے زیادہ بی اے میں اور اس کے بعد کی جانی چاہئے اور اس تربیت میں منطق، علمیات اور سائنسی تجربہ اور مشاہدہ کے بنیادی اصول کو جامعہ کے تمام متعلمین کے لیے لازم قرار دینا چاہئے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص کو معلوم ہونا چاہئے کہ کسی مسئلہ کے متعلق مناسب مواد کیونکر فراہم کیا جا سکتا ہے، ان معطیات کی بابت صحیح استدلال کر کے ان سے صحیح نتیجے کیسے اخذ کئے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علم کی ماہیئت کیا ہے، علم حاصل

ہونے کے کیا کیا ذریعے اور طریقے ہیں اور مختلف علوم کا باہمی تعلق کیا ہے۔

اس قسم کی عام ذہنی تربیت حاصل کرنے اور صلاحیتوں کو روشن کرنے کے بعد متعلم ام اے میں اور اس کے بعد اساتذہ کی ذرا سی رہبری کی بناء پر خود بخود اپنی دلچسپی کے مضامین میں اعلیٰ معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور دراصل یہیں سے ان کی حقیقی تعلیم شروع ہوتی ہے۔

ورنہ موجودہ نظام تعلیم سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والوں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر صحیح منطقی طور پر بحث بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی تقریروں میں بیسیوں ظاہر اور پوشیدہ مغالطے پائے جاتے ہیں۔ ابھی ایک جملے میں جس اصول کو مان لیا تھا دوسرے ہی جملے میں اس کے بالکل متضاد اصول کو فرض کر لیتے ہیں اور انھیں یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ان سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔ کسی بحث کو اس کے منطقی نتیجے تک نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ ایک دائرے میں چکر کاٹتے رہتے ہیں اور جہاں سے شروع کیا تھا پھر اسی نقطے پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح بحث کا وہی دائری سلسلہ بار بار دہرایا جاتا ہے اور کوئی بات تصفیہ ہونے نہیں پاتی۔ خانگی گفتگو اور کمیٹیوں میں اس چکردار (CIRCULAR) بحث کا مظاہرہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔

تعلیم یافتہ اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لیے یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ انہیں صحیح طریقہ پر بحث کرنا بھی نہ آئے۔ صحیح استدلال کے اصول ہمیں نہ تو مدرسہ اور کالج میں سکھائے جاتے ہیں اور نہ خود ہم اپنے طور پر کبھی ان سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے

میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ کی ابتدائی منزل میں منطق اور اصول علم ہر متعلم کے لئے لازم قرار دیے جانے چاہئیں۔ اس منزل کو اعلیٰ علم کی تیاری کی منزل سمجھنا چاہئے جس میں طالب علم کسی خاص مضمون کے متعلق چند بنی بنائی معلومات فراہم کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی ذہنی اور دماغی تربیت ہو اور وہ صحیح تقریر و تحریر کے قابل ہو۔ اس تربیت کی بنا پر بعد میں وہ گوناگوں موضوعوں کے متعلق بحث مباحثہ میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لے سکے اور حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ (CULTURED) کہلا سکے۔

ہمارے اکثر تعلیم یافتہ افراد بلکہ علماء اور ماہرین کو اپنے خاص مضمون کے علاوہ کسی دوسرے مضمون کے متعلق کچھ معلوم کرنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی اور بسا اوقات یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے خاص مضمون کے لئے ان دوسری معلومات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ انجینیر اور ڈاکٹر ہیں تو وہ تاریخ اور ادب سے بالکل بے بہرہ ہیں اور مورخ اور ادیب ہیں تو مبادیات سائنس سے قطعی ناواقف۔ تاریخ اور ادب پھر بھی چونکہ عالمگیر اپیل رکھتے ہیں اور پھر انسان کو ان سے کچھ نہ کچھ سابقہ پڑتا ہے اس لئے سائنس والے ان مضامین کی ابتدائی باتوں سے کم و بیش واقف ہوتے رہتے ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عوام اور آرٹس (ARTS) کے مضامین کے متعلم اور ماہرین سائنس کی بالکل ابتدائی اور موٹی موٹی باتوں سے بھی بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کی فضاء حد درجہ غیر سائنسی ہے اور سائنس کے جدید انکشافات کے متعلق تو کجا، صدہا سال پہلے حاصل کی ہوئی معلومات کے متعلق بھی کوئی بات بہت کم

لوگوں کو معلوم ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ سائنس صرف چند ماہرین کا مشغلہ ہے جس کے لئے کسی سمجھ دار شخص کو سر کھپانے کی ضرورت نہیں کیونکہ دوسروں کو ان معلومات سے ذرہ برابر فائدہ کی توقع نہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ افادیت ہی کسی مضمون سے واقفیت یا ناواقفیت کا معیار نہیں۔ بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو ہماری تہذیب (کلچر) کا جزو بن گئی ہیں اور جن سے واقف ہونا ہر تعلیم یافتہ شخص کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اس علم سے کہ زمین گول ہے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کیا فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ اکثر کاروبار میں جیسے مکان کی دیواریں اٹھاتے وقت ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ زمین چپٹی ہے، اسی طرح عملی دنیا میں اس علم کی کب ضرورت پڑتی ہے کہ سورج زمین کے گرد نہیں بلکہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ بات چیت میں تو ہم بھی کہتے ہیں کہ سورج طلوع ہو رہا ہے یا سورج غروب ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ زمین گول ہے یا چپٹی یا یہ کہ سورج گھوم رہا ہے یا زمین گھوم رہی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو مہذب (CULTURED) نہیں سمجھا جائے گا۔

اس لئے ہر تعلیم یافتہ شخص کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے اہم علوم کے عام اصولوں اور اساسی نتیجوں سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرے۔

میں بتلا چکا ہوں کہ قدیم زمانے کے اکثر بڑے علماء جامع العلوم ہوتے تھے اور مختلف مضمونوں میں اہم تحقیقات کرتے تھے۔ اب اگرچہ علوم کی

ترقی اور وسعت کی وجہ سے [illegible] کا موقع نہیں [illegible] لیکن پھر بھی اگر موجودہ
زمانے کے کسی بڑے عالم یا سائنس داں کے کارناموں پر غور کریں
تو ہم دیکھیں گے کہ ان کی تحقیق ایک چھوٹے موضوع کے تنگ دائرے
تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ متعدد وسیع موضوعوں کے متعلق اصولی انکشافات
کرتے ہیں۔ ان کی فنی اور غیر فنی تقریروں اور تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ
نہ صرف ایسے خاص مضمونوں میں بلکہ دوسرے علوم کے متعلق بھی ان کی
معلومات کس قدر وسیع ہوتی ہیں۔ انگلستان، جرمنی، فرانس اور
خود ہندوستان میں مجھے ایسے علماء سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے
جو مختلف وسیع موضوعوں پر تحقیقی کام کر رہے ہیں اور جو صرف ایک
تنگ دائرہ میں نہیں پھرا کرتے۔

یہ ایک معلومہ حقیقت ہے کہ جو لوگ صرف ایک ہی محدود مضمون
کے متعلق لکھتے پڑھتے رہتے ہیں ان کے قلم سے شاذ و نادر ہی کوئی
بلند پایہ تحقیق نکلتی ہے۔ کسی موضوع پر اعلیٰ درجہ کی تحقیق کرنے کے لئے
ضروری ہے کہ محقق کی نظر وسیع ہو اور وہ دوسرے مشابہ موضوعوں سے اس کا تعلق
معلوم کر سکے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر تحقیقی رسالوں میں ایسے مضامین
بھی کافی تعداد میں شامل ہوتے ہیں جنھیں زیادہ سے زیادہ درسی مشقوں کا رتبہ دیا جا سکتا ہے
یہ مضامین سوائے اس کے کہ رسالہ کا مقررہ حجم پورا کریں یا مصنف کی فہرست مطبوعات
میں اضافہ کریں اور کسی مصرف کے نہیں ہوتے۔ ہماری کانفرنسوں اور جلسوں میں
تو ہر دو چار صفحہ کا الٹا سیدھا لکھا ہوا مضمون "مقالہ" سمجھا جاتا ہے اور اسی لقب
سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(۵) علم کی وحدت

مختلف علوم کا باہمی ربط و تعلق

گزشتہ صفحات میں میں نے عرض کیا ہے کہ علوم و فنون کی اس کثرت میں ہم خود علم کی وحدت کو بھی بھولتے جا رہے ہیں اور صرف ایک محدود مضمون کی معلومات حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ علم کی اس وحدت کے متعلق میں یہاں مختصر طور پر بحث کرنا چاہتا ہوں جس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ مختلف علوم کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

ان علوم کو سب سے پہلے میں ایک جدول میں مرتب کرتا ہوں تاکہ ایک نظر میں یہ تعلق اور ربط واضح ہو جائے۔

۱۔ منطق (LOGIC) ۔ استدلال کا علم۔

۲۔ حساب (ARITHMETIC) ۔ عددوں کا علم

[اس میں الجبرا، احصا (ANALYSIS) وغیرہ شامل ہیں]

۳۔ ہندسہ (GEOMETRY) ۔ فضا کا علم

۴۔ علم حرکت (MECHANICS) ۔ وقت کا علم

۵۔ طبیعیات (PHYSICS) ۔ مادہ اور توانائی کا علم

[اس میں کیمیا، معدنیات، انجنیری وغیرہ شامل ہیں]

۶۔ حیاتیات (BIOLOGY) ۔ زندگی کا علم

[اس میں تشریح الابدان (ANATOMY)

فعلیات (PHYSIOLOGY) نباتیات (BOTANY)

(حیوانیات (ZOOLOGY) طب (MEDICINE) وغیرہ شامل ہیں)

۷۔ نفسیات (PSYCHOLOGY) نفس (MIND) کا علم

۸۔ عمرانیات (SOCIOLOGY) ۔ اجتماعی نفس (COLLECTIVE-MIND) کا علم (اس میں معاشیات (ECONOMICS)، تاریخ، قانون سیاسیات وغیرہ شامل ہیں)

۹۔ علمیات (EPISTEMOLOGY) ۔ علم العلوم۔

اس فہرست میں میں نے صرف انہی مضامین کو شامل کیا ہے۔ جو بحیثیت ایک باضابطہ علم یعنی سائنس کے طور پر زیر بحث آ سکتے ہیں۔ فنون لطیفہ جیسے ادب، شاعری، مصوری، موسیقی اس فہرست میں شامل نہیں کئے جا سکتے کیونکہ وہ ایک فرد کی ذاتی تخلیق ہوتے ہیں اور کسی قاعدہ یا قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کے ابتدائی اصول کا جہاں تک تعلق ہے وہ اوپر کے علوم میں سے کسی نہ کسی علم کے تحت آجاتے ہیں، مثلاً ماڈل ڈرائنگ جیومٹری کے تحت، موسیقی اور صوتیات (PHONETICS) طبیعیات کے تحت شامل ہو جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ عمرانی علوم یعنی معاشیات، تاریخ، قانون وغیرہ کی جیسی تعلیم عام طور پر ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں دیجاتی ہے اسے دراصل ایک باضابطہ علم یا سائنس کہا ہی نہیں جا سکتا۔ ان کی حیثیت محض ایک فہرست یا (CATALOGUE) کی ہوتی ہے جس میں چیدہ چیدہ واقعات درج ہوتے ہیں۔ ان واقعات میں کسی قوانین یا کلیات کی پابندی ثابت نہیں کی جاتی۔

یہ مضامین قابل لحاظ اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ ان کو ایک سائینس کی شکل میں منضبط کیا جائے لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کے کالجوں اور جامعات میں اس کی بہت کم کوشش کی جاتی ہے ۔

اب اگر مندرجہ بالا فہرست پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ تمام علوم ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں یا زیادہ صحیح طور پر ایک ہی سیڑھی کے مختلف زینے ہیں اور کسی زینے پر پہنچنے کے لئے اس سے پہلے کے تمام زینوں کو طے کرنا لازمی ہے ۔ منطق کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ استدلال کے صحیح اصول اور طریقوں سے واقفیت کے بغیر کسی علم کو حاصل کرنا ناممکن ہے ۔

علم حساب جس میں ریاضی کی دوسری بڑی شاخیں الجبرا وغیرہ شامل ہیں صرف اعداد اور ان کے باہمی تعلقات کا علم ہے جس کا دارومدار صرف منطقی اصول پر ہے ۔ اس علم میں خارجی دنیا کی اور کسی معلومات کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ یہ علم سوائے منطق کے باقی تمام علوم سے آزاد رہ کر تشکیل پاتا ہے اور حاصل کیا جاسکتا ہے ۔

علم ہندسہ یعنی جیومیٹری میں ایک نیا جز فضاء (SPACE) کا داخل ہوتا ہے اور یہ علم پہلے کے دونوں علوم یعنی منطق اور حساب پر منحصر ہے کیوں کہ اس کی تشکیل اور حصول ان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ بغیر حساب جاننے کے جیومیٹری کا سیکھنا ممکن نہیں لیکن اس کے حاصل کرنے کے لئے علم حرکت سے لے کر عمرانیات تک کسی علم کی ضرورت نہیں ۔

علم حرکت میں اعداد اور فضا کے علاوہ ایک تیسرا نیا جز وقت کا داخل

ہوتا ہے جو اس سے قبل کے علوم یعنی منطق، حساب اور جیومیٹری میں نہیں پایا جاتا۔ علم حرکت اپنے سے قبل کے ان تینوں علوم پر منحصر ہے لیکن اپنے سے بعد کے علوم یعنی طبیعیات سے لے کر عمرانیات تک تمام علوم سے آزاد ہے۔

علم طبیعیات میں ان سابقہ اجزا یعنی عدد، فضا اور وقت کے علاوہ ایک نیا عنصر "مادہ اور توانائی" کا داخل ہوتا ہے یعنی اس علم میں جن مظاہر اور واقعات سے بحث ہوتی ہے ان میں یہ چاروں عناصر عدد، فضا، وقت اور مادہ اور توانائی شامل ہیں۔ (جدید تحقیقات کے بموجب مادہ اور توانائی دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز ہے)۔ طبیعیات کا علم اپنے قبل کے تمام علوم یعنی منطق، حساب، ہندسہ اور علم حرکت پر منحصر ہے اور اپنے اور اپنے بعد کے تمام علوم یعنی حیاتیات، نفسیات اور عمرانیات سے بالکل آزاد ہے۔ اس میں کیمیا، معدنیات، انجنیری وغیرہ تمام مضامین شامل ہیں جن میں مادہ توانائی اور ان کے تغیروں سے بحث ہوتی ہے۔

علم حیاتیات میں ایک نیا عنصر "زندگی" کا داخل ہوتا ہے جو اس سے قبل کے تمام علوم میں مفقود ہے۔ چونکہ زندگی کا ظہور بغیر مادہ اور توانائی کے واسطے کے ممکن نہیں اس لئے علم حیاتیات میں سابقہ تمام اجزا یعنی مادہ، توانائی، وقت، فضا اور عدد بھی شامل ہوتے ہیں اس وجہ سے یہ علم طبیعیات، کیمیا اور ان کے ذریعے سے علوم ریاضی پر منحصر ہوتا ہے۔ علم حیاتیات کو تشکیل دینا اور اس کو حاصل کرنا بغیر علوم طبیعیات اور ریاضی کے ممکن نہیں۔ لیکن علم حیاتیات اپنے بعد کے علوم نفسیات اور عمرانیات سے بالکل آزاد رہ سکتا ہے۔ علم حیاتیات میں تشریح الابدان، فعلیات، طب، نباتیات، حیوانیات وغیرہ تمام مضامین

شامل ہیں جن میں زندگی اور اس کے مختلف مظاہروں سے بحث ہوتی ہے۔

اس کے بعد نفسیات کا علم آتا ہے۔ اس علم میں ایک نیا عنصر "نفس" کا داخل ہوتا ہے جو اس سے قبل کے تمام علوم میں مفقود ہے چونکہ نفس صرف زندہ اجسام میں ہی پایا جاتا ہے اور زندگی بغیر مادہ اور توانائی کے واسطے کے ظہور پذیر نہیں ہوتی اس لئے نفسیات میں سابقہ تمام اجزا یعنی زندگی، مادہ اور توانائی وقت، فضا، اور عدد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ علم حیاتیات اور طبیعیات پر اور ان کے ذریعہ سے علوم ریاضی پر منحصر ہوتا ہے۔ بغیر علوم حیاتیات طبیعیات اور ریاضی کے نفسیات کو باضابطہ تشکیل دینا اور اس کو حاصل کرنا ممکن نہیں۔

اس سے بھی اونچے زینے پر عمرانیات کا علم ہے جو ایک فرد کے نفس سے نہیں بلکہ ایک جماعت یا گروہ کے نفس سے بحث کرتا ہے اور اس طرح یہ جماعت اور بالآخر ساری نوع انسان پر حاوی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ علم فرد کی نفسیات پر منحصر ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں نفسیات خود علم حیاتیات، طبیعیات و ریاضیات پر منحصر ہے اس لئے لازماً عمرانیات بھی ان تمام علوم کے تابع ہے۔ اس کو باضابطہ طور پر تشکیل دینا یا حاصل کرنا بغیر ان سابقہ علوم کے ممکن نہیں۔ عمرانیات میں معاشیات، تاریخ، قانون اور سیاسیات وغیرہ تمام مضامین شامل ہیں جو جماعتوں اور گروہوں سے بحث کرتے ہیں۔

میں نے سب سے آخری اور بلند ترین زینہ پر علمیات، یعنی نظریۂ علم (EPISTEMOLOGY THEORY OF KNOWLEDGE) کو رکھا ہے جو کائنات کی حقیقت سے بحیثیت مجموعی بحث کرتا ہے۔ تمام دوسرے علوم کے بنیادی اصولوں اور نتیجوں کی صحت و صداقت کو پرکھتا ہے

اور ان کے باہمی تعلق پر غور کرتا ہے۔ اس طرح گویا یہ علم العلوم ہے اور باقی تمام علوم پر منحصر ہے اور بغیر ان علوم کے تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔

اس طرح علوم کی یہ تقسیم اور ترتیب جو مندرجہ بالا فہرست میں دی گئی ہے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر علم اپنے سے پہلے کے تمام علوم پر منحصر ہوتا ہے اور اپنے سے بعد کے تمام علوم سے آزاد ہوتا ہے۔ ہر علم میں وہ سب عناصر یا اجزا موجود ہوتے ہیں جو سابقہ علوم میں پائے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ ایک نیا عنصر یا جز داخل ہوتا ہے جو سابقہ علوم میں مفقود ہوتا ہے۔ یہ اجزا حسب ذیل ہیں :۔

عدد، فضا، وقت۔ مادہ اور توانائی، زندگی، نفس، اجتماعی نفس۔ اس لئے ظاہر ہے کہ بغیر ریاضی کے طبیعیات ممکن نہیں، بغیر طبیعیات کے حیاتیات ممکن نہیں، بغیر حیاتیات کے نفسیات ممکن نہیں اور بغیر نفسیات کے علوم عمرانی ممکن نہیں۔ یہ حقیقت ہمارے بہت سے متعلمین اور معلمین کے لئے شائد انوکھی اور حیرت انگیز ہو لیکن میں نے اوپر جو تحلیل کی ہے اور جو استدلال کیا ہے اس کی روشنی میں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ ہمارے کالجوں اور جامعات میں عام طور پر ان علوم کو اور خصوصاً نفسیات اور عمرانی علوم کو آزادانہ پڑھایا جاتا ہے، نفسیات کے معلم اور متعلم علم حیاتیات سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں اور عمرانیات کے معلم اور متعلم حیاتیات اور طبیعیات تو کجا خود علم نفسیات سے بھی بالکل کورے ہوتے ہیں۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ عام طور پر یہی عمل درآمد ہوتا ہے لیکن کیا اس کا نتیجہ ظاہر نہیں ہے کہ ہمارے یہ نفسیاتی اور

عمرانی مضامین باضابطہ 'علم' کا درجہ حاصل کرنے کی بجائے محض چند مختلف واقعات کا مجموعہ بن کر رہ گئے ہیں جن کی کوئی سائنسی قدر و قیمت نہیں حالانکہ یہ علوم انسانوں کے لیئے سب سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ اہم ہیں —
غلط فہمی یا خوش اعتقادی کی بنا پر ان مضامین کا موجودہ طریقۂ تعلیم جامعات میں جاری رکھا جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں ورنہ ہر صاحبِ فکر پر اس تعلیم کا غلط اور بے سود ہونا ظاہر ہے۔ جب کسی شخص کو انفرادی نفس کی حقیقت اور اس کے اصول ہی سے واقفیت نہ ہو تو وہ کس طرح اجتماعی نفس کے اعمال اور اصول کو سمجھ سکتا ہے۔ اگر کوئی متعلم زندگی کی حقیقت ہی سے ناواقف ہو تو وہ نفس کے عمل کو کیسے جان سکتا ہے۔ اگر کسی کو مادہ اور توانائی کے اصول ہی معلوم نہ ہوں تو وہ کیسے توقع کر سکتا ہے کہ زندگی کے متعلق کوئی علم حاصل کرے جب کہ زندگی کا ظہور بغیر مادہ اور توانائی کے ممکن نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دوسروں کی بتلائی ہوئی چند باتوں کو یا مختلف سرسری اور ابتدائی مشاہدوں کو یاد کر لیا جائے لیکن کیا اسی کا نام علم ہے۔ علم کا مقصد قدرت پر قابو حاصل کرنا اور مستقبل کی پیش بندی کرنا ہے۔ کیا ان مضامین کی موجودہ تعلیم سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے؟ کیا ہمارے عمرانی علوم معاشیات، تاریخ، قانون وغیرہ کی سائنسی قدر و قیمت کو طبیعی اور حیاتی علوم کی سائنسی قدر و قیمت سے کچھ بھی مناسبت ہے؟

دوسرا اعتراض اس اسکیم پر یہ ہو سکتا ہے کہ کسی ایک شخص کے پاس نہ تو اس قدر وقت ہوتا ہے اور نہ یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ کسی نفسیاتی یا عمرانی علم کو حاصل کرنے سے قبل طبیعی اور حیاتی دنیا بھر کے تمام علوم حاصل کرے۔ بادی النظر میں یہ اعتراض بجا معلوم ہوتا ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ان

دقتوں کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر عمرانیات کا متعلم ریاضی، طبیعیات اور حیاتیات کے تمام اصول و فروع، کلیات و جزویات پر حاوی ہو بلکہ متعلقہ امور کے صرف بنیادی اصول اور اہم نتیجوں سے واقفیت کافی ہے۔ حالانکہ طبیعیات کے علم کا سارا دارومدار ریاضی پر ہے لیکن کوئی ماہر طبیعیات ریاضی کی تمام شاخیں تو کجا صرف ایک شاخ کی تمام تفصیلات سے بھی واقف نہیں ہوتا بلکہ طبیعیات والوں کے لئے ریاضی کے ضروری اہم اجزا مختص کر دیے جاتے ہیں اور انہی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ ہونا چاہئے کہ حیاتیات کے طالب علموں کے لئے طبیعیات اور ریاضی کے ضروری اور اہم اجزا مختص کر دیے جائیں، نفسیات کے متعلمین کے لئے حیاتیات اور طبیعیات کے ضروری اور اہم اجزا مختص کر دیے جائیں۔ اور علوم عمرانی کے متعلمین کے لئے نفسیات، اور حیاتیات، کے ضروری اور اہم اجزاء مختص کر دیے جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرح عمرانی علوم کے متعلمین پر زیادہ بار پڑتا ہے اور انہیں زیادہ ابتدائی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن جن کے رتبے سوا ہیں ان کی مشکلیں سوا ہوتی ہیں۔ جنھوں نے اپنی منزل مقصود کو زیادہ بلندی پر اور زیادہ فاصلے پر مقرر کیا انھیں اوروں کی بہ نسبت زیادہ راستہ کرتے سے اور زیادہ تکلیفیں اٹھانے سے نہیں گھبرانا چاہئے۔ جن کو وقت اور پیسہ عزیز ہو وہ اس گلی میں جائیں ہی کیوں؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عمرانی علوم پیچیدہ ترین علوم ہیں جن میں علادوں سے لے کر اجتماعی نفس تک تمام عناصر اور اجزا شامل ہوتے ہیں اور ان کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے ان تمام عناصر

کا علم مناسب حد تک ضروری ہے اور خصوصاً حیاتیات اور نفسیات کے بنیادی اصول اور اہم نتیجوں سے اچھی خاصی واقفیت ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص ان پیچیدگیوں اور طویل تیاریوں سے گھبراتا ہے یا ان سے کما حقہٗ عہدہ برا ہونے کی قابلیت اور صلاحیت نہیں رکھتا تو بہتر تو یہی ہے کہ وہ ان عمرانی علوم کو ہاتھ ہی نہ لگائے بلکہ مقابلتہً زیادہ سادہ علوم مثلاً ریاضی اور طبیعیات کی طرف رجوع کرے۔ جب تک عمرانی علوم کے معلمین اور متعلمین ان ضروری شرائط کو پورا نہیں کریں گے یہ مضامین حقیقی عالمانہ (سائنسی) حیثیت حاصل نہیں کریں گے اور انسانوں کی سماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں ان سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ چنانچہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جو معاشیات اور تاریخ وغیرہ کالجوں اور جامعات میں پڑھائی جاتی ہیں ان سے انسانی سوسائٹی کو کوئی قابل لحاظ رہبری اب تک حاصل نہیں ہوئی ہے بلکہ سوسائٹی اب تک پچھلے مشاہدوں، تجربوں اور روایات کی بناء پر نہایت غیر سائنسی طریقے پر چلتی رہی ہے۔

علوم کی جو ترتیب میں نے اوپر دی ہے اس میں انسانی سوسائٹی اور تمدن کے نقطۂ نظر سے ریاضیات سے شروع کر کے عمرانیات تک فوری افادیت بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔ انسانوں کے لئے سب سے کم فوری ضرورت اور قریبی تعلق رکھنے والا علم ریاضی کا اور سب سے زیادہ قریبی تعلق رکھنے والا علم عمرانیات کا ہے جس میں تاریخ و معاشیات وغیرہ شامل ہیں لیکن یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ

صحیح اور زیادہ ترقی یافتہ علم ریاضی کا اور سب سے کم صحیح اور کم ترقی یافتہ علم عمرانیات کا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ علوم بہت زیادہ پیچیدہ ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان علوم کے نام لیوا اپنے میں وہ سائنسی قابلیت اور صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو ان علوم کی تشکیل اور ترقی کے لئے ضروری ہیں۔

---

(۶) انسانی وحدت کی تعلیم

تمام ملکوں کی موجودہ تعلیم میں ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ کم عمری ہی میں بچوں کے دل و دماغ میں تنگ نظری وطن پرستی اور محدود قومیت کا احساس پیدا کر دیا جاتا ہے اور انہیں عالمگیر برادری اور انسانی اخوت و مساوات کا کوئی سبق نہیں پڑھایا جاتا۔ افسوس ہے کہ بعض جدید تعلیمی اسکیموں میں بھی اسی محدود وطن پرستی اور جغرافی قومیت کا فرسودہ اور مہلک راگ الاپا جا رہا ہے اور معدودے چند مستثنیات کے علاوہ ہر گھر میں اور ہر تعلیمی اور تربیتی ادارہ میں بچوں اور نوجوانوں کے رگ و ریشہ میں وطنیت کے اس زہر کا انجکشن دیا جا رہا ہے۔

ہر کس و ناکس صرف اپنی اور اپنے نام نہاد جغرافی وطن کی خیر منا رہا ہے حالانکہ اب ساری دنیا کی قسمت ایک ہی رشتہ سے مربوط ہے اور سب کو معلوم ہے کہ یا تو ساری دنیا کی تجارت ایک ساتھ ہو گی یا کسی ایک ملک کی بھی نہیں ہو گی۔

اس لئے انسانوں اور خصوصاً نئی نسلوں کو اس تعلیم کی سخت ضرورت ہے کہ ساری زمین ایک ہی غیر منقسم اکائی ہے۔ بچوں اور نوجوانوں میں ابتداء ہی سے یہ شعور پیدا کیا جانا چاہئے کہ سب انسان ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں اور رنگ، نسل اور جائے پیدائش کا فرق قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اس کے لیے سب سے پہلے خود بڑے بوڑھے لوگوں میں اس عالمگیر انسانی وحدت کا احساس موجود ہونا چاہئے۔

اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ خدا کی زمین کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرنے اور

خدا کے بندوں کو متعدد گروہوں میں بانٹنے کے تمام معیاروں اور طریقوں کو ختم کر دیا جائے اور سارے انسانوں کو ایک ہی رشتۂ وحدت میں باندھ دیا جائے۔

اگر تمام انسان اسلام کی اس تعلیم کو حرزِ جاں بنالے کہ

من اول آدمِ بے رنگ و بوئم
ازاں پس رومی و تاتاریم من

تو اس خوفناک تباہی و بربادی کا جو دنیا کے ہر خطہ میں جاری ہے سامنا کرنا نہ پڑتا۔ میرا کامل ایقان ہے کہ اگر نوعِ انسان کو کوئی چیز اس خودکشی سے بچا سکتی ہے تو وہ یہی اسلامی اصول ہے کہ ساری زمین ایک غیر منقسم وحدت ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کا وطن ہے۔

"ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"

امن عالم کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اس نکتہ کی اہمیت کو کماحقہ، محسوس نہ کیا جائے۔ دراصل ساری خرابی اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہے کہ لوگ پرانے اقدار کو مضبوط پکڑے ہوئے ہیں اور نئے اور بدلے ہوئے حالات کے تحت ان کا جائزہ نہیں لینا چاہتے۔ اگر وطنیت اور قومیت کے مروجہ تصور کی سائنسی تحلیل کریں تو ہم دیکھیں گے کہ زمین کی جغرافی تقسیم اور نوعِ انسان کی رقبی گروہ بندی اس زمانے میں قطعی مہمل اور ناقابل عمل ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسانوں کے پاس ذرائع حمل و نقل کچھ نہیں تھے اور سمندروں اور پہاڑوں کا عبور کرنا تو کجا ندیوں اور دریاؤں کا پار کرنا بھی ان کے لئے مشکل تھا۔ جہاں تک ان کی رسائی تھی ان کی دنیا وہیں تک

محدود تھی۔ انسانی جماعتوں کی توسیع ان کے ذرائع حمل ونقل کی ترقی کے متناسب رہی ہے۔ خاندان، قبیلہ، قریہ، شہر اور ملک کا ارتقا اور ان کی تشکیل اسی طرح ہوئی ہے کہ انسانوں کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی سہولتیں زیادہ مہیا ہوتی چلی گئیں۔ سائنس اور تمدن کی ترقی کے ساتھ انسان کا وطن قریہ اور قصبہ سے گزر کر شہر اور ملک تک پہنچ گیا۔ ابتدائی زمانے میں جغرافی حالات انسانوں کے لئے فیصلہ کن تھے اور وہ مجبور تھے کہ پہاڑوں اور دریاؤں سے گھرے ہوئے خطوں کو ایک وحدت تصور کریں اور ان میں بسنے والوں کو ایک قوم پائیں۔ موجودہ زمانے میں ہم نے اس ارتقائی ماحول کو ملحوظ نہیں رکھا اور جب تک ہم اس قانون قدرت کے خلاف جائیں گے، ہماری مشکلوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ غور تو کیجئے کہ ایک طرف تو انسان نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں اور زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں اور دوسری طرف وہ اسی جغرافی وطنیت کے چکر میں مبتلا ہے اور نہیں سمجھتا کہ طیاروں اور ہوائی جہازوں نے جغرافی سرحدوں کے تصور کو قطعی مہمل بنا دیا ہے۔ جب دو تین دن میں انسان ساری دنیا کا چکر آسانی سے لگا سکتا ہے تو ایسی صورت میں یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ کرۂ ارض کے کوئی دو مقام ایک ہی جغرافی اکائی میں ہیں اور باقی مقام اس جغرافی اکائی میں نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے ذہنی اور سیاسی جمود کی وجہ سے جغرافی وطنیت اور رقبی قومیت کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکتے حالانکہ سائنس کا یہ صریح اور قطعی فیصلہ ہے کہ اب جغرافی اکائیوں اور مختلف آزاد ملکوں کے

تصور کا دور ختم ہو چکا ہے۔ کوئی سمجھ دار شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ جغرافی اکائیاں سائنٹفک یا آئیڈیل ہیں۔ یہ امر بالکل تاریخ کے حادثات اور اتفاقات پر منحصر نہیں کہ کسی ملک کی جغرافی سرحد ایک حد تک پہنچ کر رہ گئی اور آگے نہیں بڑھ سکی اور جغرافی اکائی کوئی مطلق نہیں بلکہ اضافی اکائی ہے۔

اس کے علاوہ سوچنا چاہئے کہ اس زمانے میں جغرافی اکائی کی تعریف کیا کیجا سکتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہمالیہ ہندوستان کو تبت سے جدا کرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وندھیاچل بھی تو دکن کو شمالی ہند سے جدا کرتا ہے تو پھر کیوں ہندوستان اور تبت کو دو جغرافی اکائیاں سمجھا جائے اور دکن اور شمالی ہند کو دو جغرافی اکائیاں نہ سمجھا جائے۔ بلکہ اس جغرافی اکائی کا منطقی نتیجہ یہ نکالنا چاہئے کہ جہاں کہیں کوئی خطہ زمین کسی پہاڑی اور تالاب سے گھر جائے اس کو ایک جغرافی اکائی اور علیحدہ ملک تسلیم کر لیا جائے یہ تو کوئی منطق نہیں کہ کوئی کہے ہم اسی حد تک تقسیم کریں گے اور اس کے آگے تقسیم کرنا نہیں چاہتے۔ اب نہ تو ہندوستان جغرافی اکائی ہو سکتا ہے نہ صرف انگلستان اور نہ صرف امریکہ بلکہ ساری دنیا ایک ہی جغرافی اکائی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ ساری دنیا کو ایک غیر منقسم وحدت کے طور پر لیا جائے کیونکہ اب سیاسی اقتصادی اور عمرانی مسائل کو علیحدہ علیحدہ متعدد آزاد ملکوں کے لئے حل کرنا قطعی ناممکن ہے۔ یہ مسائل ساری دنیا کے لئے بحیثیت مجموعی حل کئے جا سکتے ہیں ورنہ اگر ان آزاد خودمختار ملکوں اور جغرافی اکائیوں کے وجود کو برقرار رکھا جائے تو کسی ایک مسئلہ کا حل کرنا بھی ممکن نہیں اور یہ کشمکش، ہلاکت اور خونریزی ہمیشہ جاری رہے گی۔ ہمارے تمام عمرانی اور اقتصادی

مسائل اسی وقت حل ہوں گے جب کہ ساری دنیا کو ایک وحدت سمجھا جائے ورنہ پھر وہی حشر ہوگا جو مجلس اقوام کا ہوا کہ وہ کسی ایک مسئلہ کو بھی حل کرنے کے قابل نہیں ہو سکی متحدہ آزاد ملکوں کا تصور برقرار رکھا جائے تو پھر باہمی رقابتوں اور برتری کی کوششوں کا جاری رہنا یقینی ہے اور اس کے ساتھ عالمگیر جنگوں کا جاری رہنا بھی اسی طرح یقینی ہے۔

اس جغرافی تقسیم اور وطن پرستی کی غلط تعلیم نے یہ سارا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے ہوس نے نوع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں اور خدا کی زمین کو مختلف جماعتوں نے تقسیم کر کے خاص اپنی مملکت بنا لیا ہے پھر کیا تعجب ہے اگر یہ مختلف مفاد آپس میں ٹکرائیں اور وہ ہولناک شرارہ پیدا ہو جو اب ساری نسل انسانی کو فنا کر دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔ ملکوں اور جماعتوں کے لئے اس وقت بالکل زیبا نہیں کہ وطن پرستی اور جغرافی اکائیوں کی تبلیغ کر کے اس آگ پر اور تیل چھڑکیں۔ کیا اس وقت ضرورت نہیں کہ تمام انسان اسلام کی اس تعلیم کو حرز جاں بنائیں کہ ہماری زمین ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے جو سارے انسانوں کا وطن ہے، جس میں ہر شخص کے لئے آزادی ہے کہ وہ جہاں چاہے اپنی زندگی بسر کرے۔ تمام دنیا میں صرف ایک ہی قوم ہے اور وہ امریکی یا جرمن یا ہندوستانی قوم نہیں بلکہ انسانی قوم ہے۔ مختلف ممالک جغرافی یا قومی اکائیاں نہیں بلکہ انتظامی اکائیاں ہیں جیسے ایک ہی ملک کے مختلف صوبے اور اضلاع ہوا کرتے ہیں اس تعلیم سے انسانوں کے ذہن میں انسانیت کا صحیح تصور پیدا ہوگا اور وہ دنیا اور نوع انسان کی مجموعی اکائی کا خیال پہلے اور جغرافی رقبوں کا خیال بعد کریں گے۔ انسانی نسل آئندہ اسی طرح

باقی رہ سکتی ہے ورنہ اگر مختلف آزاد جغرافی قوموں اور اکائیوں کے نظریہ پر اسی طرح عمل درآمد ہوتا رہا تو ہر چند سال کے بعد مہلک سے مہلک تر جنگ کا چھڑ جانا لازمی ہے اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوگا وہ ظاہر ہے۔

غرض تاریخ کی تعلیم اسی عالمگیر نقطۂ نظر سے ہونی چاہئیے اور کسی خاص ملک اور اس کے باشندوں کی تاریخ کو اس عالمگیر تاریخ کے ضمن میں پڑھانا چاہئیے۔ اس کے خلاف موجودہ نظام تعلیم میں اور نئی تعلیمی اسکیموں میں ابتدا نہ صرف اپنے ملک کی بلکہ اپنے صوبہ یا ضلع کی تاریخ سے کی جاتی ہے جس سے بچہ میں تنگ نظری اور تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے صرف اپنے ملک یا صوبے کے لوگوں سے محبت ہوتی ہے اور باقی ساری دنیا کو اپنا اور اپنے لوگوں کا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔

---

(۷) ایمان اور علم

میرے نزدیک یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور ترقی کے لئے دو اجزا لازمی ہیں یعنی ایمان اور علم۔ ان ہی دو اجزاء کی موجودگی میں فرد اور جماعت میں وہ خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جو متمدن زندگی کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔ کسی قوم کے بقا اور ارتقاء کا دارومدار ایمان اور علم ہی پر ہوتا ہے اور جب تک یہ دونوں اجزا ایک خاص حد تک کسی قوم میں موجود رہتے ہیں وہ قوم ترقی کرتی رہتی ہے۔

جو قومیں بظاہر کسی مذہب کی پیرو نہیں وہ بھی کسی نہ کسی سیاسی یا معاشرتی اصول پر یا وطن اور ملک پر ایمان رکھتی ہیں اور اس کی خاطر لڑنے مرنے تیار رہتی ہیں۔ آج کل امریکہ، انگلستان، جرمنی، روس اور جاپان کی جو طاقت نظر آتی ہے اس کی تحلیل کی جائے تو یہی دو اجزاء ایمان اور علم نظر آئیں گے۔ ایمان سے عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے اور علم سے عمل کے لئے ہتھیار میسر ہوتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ جن جماعتوں کا ایمان خدائے واحد پر ہو اور جن کے لئے ان کے مذہب نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا بہترین لائحہ عمل بنا دیا ہو اگر ان کا ایمان پختہ اور یقین محکم ہو اور اسی کے ساتھ وہ اپنے ہاتھوں میں علم کی طاقت بھی رکھتے ہوں تو ان کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی۔

موجودہ نظام تعلیم کا اور اکثر جدید تعلیمی اسکیموں کا ایک بہت بڑا

نقص یہ بھی ہے کہ ان میں مذہبی اور دینیاتی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں بلکہ بہت سے سربرآوردہ لوگ تو ایسی تعلیم کو مضر سمجھ کر اس سے پرہیز کرتے ہیں اور اس کے انتظام سے ممانعت کرتے ہیں کیونکہ ان کی دانست میں مختلف مذاہب کے پیروؤں میں باہمی اختلافات اور جھگڑوں کا اندیشہ ہے۔ لیکن یہ اندیشے ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ کسی شئے کا غلط استعمال اس شئے کو ناجائز نہیں بنا سکتا۔ اگر مذہب کی غلط تعلیم سے مختلف جماعتوں میں باہمی مخالفت پیدا ہوتی ہے تو اس مذہب کا کیا قصور ہے؟ صحیح طریقہ پر تعلیم کا انتظام کرنا چاہئے۔ لیکن یہ تو کوئی سمجھ کی بات نہیں کہ سرے سے مذہب کی تعلیم ہی کو اڑا دیا جائے۔

اسی قسم کا استدلال سیاسیات اور خود سائنس کے متعلق بھی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف سیاسی نظریوں کی بنا پر اقوام عالم ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں اور سائنس کی طاقت کے غلط اور ناجائز استعمال سے اپنی باہمی جنگوں کو مہلک سے مہلک تر بناتے جا رہے ہیں۔ لیکن کوئی سمجھ دار شخص یہ نہیں کہے گا کہ ان وجوہ کی بنا پر سیاسیات اور سائنس کی تعلیم کسی کو نہ دی جائے۔

جن جماعتوں کا مذہب اتباقی ہے، جو اپنے مذہب کے الہامی ہونے پر اعتقاد رکھتی ہیں اور جن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اہم پہلو مذہب کے تحت آتا ہے انہیں بجا طور پر یہ شکایت ہو سکتی ہے کہ مدرسوں میں ان کے بچوں کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ میں نے ابتداء میں کہا ہے کہ فرد کی زندگی کے تین بڑے پہلو ہوتے ہیں، جسمانی، ذہنی اور روحانی زندگی

اور اگر ان میں سے کسی ایک پہلو کا بھی نشو و نما کم ہو تو فرد کی زندگی مکمل نہیں ہوتی چہ جائے کہ ایک پہلو کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے۔ مدرسوں میں بچوں کی جسمانی اور ذہنی پہلوؤں کی تو تربیت اور پرداخت کی جاتی ہے لیکن ان کی شخصیت کے روحانی پہلو کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی حالانکہ یہی سب سے اہم پہلو ہوتا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کا انتظام والدین خانگی طور پر کریں وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ تمام والدین کی مالی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اچھی تعلیم کا انتظام اپنے طور پر کر سکیں۔ اس کے علاوہ اگر خانگی انتظام ہی کرنا ہے تو پھر ذہنی اور جسمانی تعلیم کا انتظام بھی خانگی طور پر کیوں نہ ہو۔ فرد کے ذہنی اور جسمانی پہلوؤں کو روحانی پہلو کے مقابلہ میں آخر کس بناء پر ترجیح دی جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اگر انفرادی زندگی کو مکمل اور جماعت کو دنیا میں ہر جہتی ترقی کے قابل بنانا ہے تو تعلیم کا تمام نظام عمل اس نقطے پر مرکوز رہنا چاہئے کہ نوجوان نسلوں کے ایمان کو مستحکم کیا جائے اور انھیں جدید ترین علوم کا ماہر بنایا جائے۔ انسان میں سے کسی ایک جزو کی بھی کمی ہو تو تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس نقطۂ نظر سے میں ہماری موجودہ تعلیم و تربیت کا جائزہ لوں گا اور آئندہ کے لئے چند تجویزیں پیش کروں گا۔

---

(۸) ابتدائی اور ثانوی تعلیم

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد جب رہی سہی برائے نام حکومت بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور ہمارے ملک پر دو سروں کا قبضہ ہو گیا تو قوم کے رہنماؤں اور زمانے کے نبض شناسوں نے تاکید کی کہ اگر یہاں زندہ رہنا ہے تو انگریزی پڑھو اور جدید تعلیم حاصل کرو چونکہ ہر جدید شئے لذیذ ہوتی ہے یہ نسخہ جو ہمارے ہاتھ لگا تو ہم نے اس کا ایسا استعمال کیا کہ مرض تو شاید گیا ہو یا نہ گیا ہو لیکن مریض تو دین و دنیا دونوں سے جاتا رہا۔ ابتدا اکھاتے پیتے گھرانوں سے ہوئی اور ان کی دیکھا دیکھی متوسط طبقہ اور معمولی خاندانوں میں بھی یہ رواج بڑھتا گیا۔ بچہ ایک دو سال کا ہوتے ہی اس پر والدین کی حیثیت کے موافق گورنس (GOVERNESS) "نرس" یا "آیا" مقرر کر دی جاتی ہے جو نہ صرف ہمارے مذہبی عقائد اور تمدنی روایات سے بلکہ شریف گھرانوں کے رسم و رواج سے بھی بالکل ناواقف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں رات دن گزارتے ہوئے بچے نے خدا اور رسول کا نام کبھی کاہے کو سنا ہوگا اور اپنی قوم کی قدیم و جدید تاریخ اور تہذیب کی کوئی بات اس کے کانوں تک کبھی کیوں پہنچی ہو گی۔ ان میں سے اکثر والدین کی تو یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کا بچہ شکسپیئر نہیں تو کم از کم برنارڈ شا ضرور ہو جائے۔ اس لئے گھر کے تمام رہنے والے آپس میں عام طور پر اور بچے کے سامنے خاص طور پر انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں تاکہ بچے کی گھٹی میں ہی

اے۔ بی۔ سی پڑھ جائے۔

پھر جب بچے کی عمر مدرسہ جانے کے قابل ہوتی ہے تو سب سے پہلے کسی "کانونٹ" یا مشن اسکول کی تلاش ہوتی ہے جہاں کی فضا خالص مغربیت سے بھری ہو اور جہاں اپنے مذہب، اپنے رواج اور اپنی زبان کی ہوا بھی لگنے نہ پائے۔ لڑکوں کی عمر کا سب سے زیادہ اثر پذیر حصہ جب اس ماحول میں گزرے گا تو اس میں سے فارغ ہو کر نکلنے والے لڑکوں سے قوم اور جماعت کو کیا توقع ہو سکتی ہے؟

خاندان والوں کو اس پر فخر ہوتا ہے کہ ان کا لڑکا انگریزی میں فصیح گفتگو کر سکتا ہے، اس کا لب و لہجہ بالکل انگریزوں کا سا ہے! اسکرپچر (SCRIPTURE) اسے لفظ بلفظ حفظ ہیں، ۱۰۶۶ء سے آج تک کی ساری تاریخ انگلستان پر وہ عبور رکھتا ہے۔ یورپ کے ہر دریا کا طول و عرض اسے معلوم ہے۔ اس کی طرف شائد والدین کی نظر کبھی نہیں پڑتی کہ صاحبزادہ کو اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے ملک کے متعلق کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ہماری تاریخ کے اہم دور کیا ہیں اور آج کل کن چیزوں کی کمی نے ہمیں علم و ہنر مال و دولت کے لحاظ سے ہمسایہ قوموں کی بہ نسبت کم تر کر رکھا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان "اسکولوں" میں پڑھنے والے صاحبزادوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ بھی کسی قوم کے فرد ہیں اور ان کی قوم کی حالت زار و زبوں ہے۔ ان کی حدِ نظر صرف خاندان کے ان افراد تک اور اپنے حلقہ کے ان نوجوانوں تک ہوتی ہے جو ان سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور جو انہیں کی طرح

فارغ البالی اور عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنی جماعت کی کمزوری کا علم اس لیے انھیں نہیں ہوتا کہ خدا کے فضل سے ان کے والدین دولتمند ہیں اور اس لیئے ان کی ہر حاجت رفع ہو جاتی اور ان کی منہ مانگی مراد برآتی ہے۔ اگر اتفاقاً کبھی ان کی نظر اپنی جماعت کی تباہی پر پڑ جاتی ہے تو انھیں اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کیونکہ بہر حال وہ اور ان کے خاندان کے لوگ بخیر و عافیت ہیں۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ جب ان کی جماعت کے اکثر افراد تباہ و برباد ہو جائیں گے تو وہ کس کے بل بوتے پر عیش و عشرت کریں گے اور پھر انہیں کون چین سے رہنے دیگا۔

یہ تو ہوا ان اسکولوں کے تعلیم یافتہ لڑکوں کا معاشرتی پس منظر۔ اب ذرا اس پر غور کیجئے کہ ان کی تعلیمی حالت کیا ہوتی ہے اور ان کی زندگی کے اقدار کیا ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی لکھنا پڑھنا انہیں ایک حد تک آجاتا ہے، اور اس زبان میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ ان کی زندگی کی لذتیں زیادہ تر یہی ہوتی ہیں کہ نفیس لباس پہنیں، جدید ترین ماڈل کی موٹر گاڑیوں میں سواری کریں، زیادہ سے زیادہ تعداد میں سینما اور تماشے دیکھیں اور آئے دن بمبئی، کلکتہ یا مدراس کی سیر کریں۔ علمی اور ادبی کتابوں کا تو کیا ذکر کوئی معمولی ناول بھی ان کے ہاتھوں میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے کیونکہ کتابوں سے دلچسپی پیدا کرنے اور لطف اٹھانے کا فن انہیں آتا ہی نہیں اور پھر غیر زبان آخر غیر زبان ہی ہے۔ اس نوعمری میں کسی غیر زبان کی اعلیٰ پایہ کی کتابوں کا سمجھنا اور لطف اٹھانا ان کی بساط سے باہر ہے۔ ہر زبان کا

ادب اس زبان کو بولنے والی قوم کے تمدن اور اس کی روایتوں اور تاریخ کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہمارے نونہال انگریزی کی تلمیحیں، تمثیلیں اور استعارے کما حقہ، کیسے سمجھ سکتے ہیں جو ان کتابوں سے محظوظ ہو سکیں۔ پس اگر روزانہ کی سیر و تفریح سے کبھی وہ اُکتا جائیں تو ان کے مبلغ علم میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو انھیں اپنی طرف کھینچ سکے۔ کسی انسان کی اور خصوصاً ایک ناتجربہ کار نو عمر شخص کی زندگی میں یہ نفسیاتی کیفیت کس حد تک خطرناک ہوتی ہے اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اکثر سمجھ دار والدین اس کیفیت سے ناواقف نہیں ہیں۔

ان انگریزی مدرسوں میں سے پڑھ کر نکلنے والے نوجوانوں کو خود اپنی زبان سے بھی عار ہوتا ہے۔ وہی ٹوٹے پھوٹے دو چار جملے گھر میں یا باہر اتفاقاً سیکھ لئے ہوں تو ہوں ورنہ لکھنا پڑھنا تو درکنار وہ اردو میں چند منٹ مسلسل گفتگو بھی نہیں کر سکتے۔ دوستوں اور ملاقاتیوں سے والدین فخریہ طور پر کہا کرتے ہیں کہ برخوردار کو اردو نہیں آتی لیکن ماشاء اللہ انگریزی میں بچہ وہ طاق ہے کہ اچھے اچھے انگریزوں کو مات کردے!! ۔ کوئی ان سے یہ نہیں پوچھتا کہ حضرت انگلستان میں اگر کوئی انگریز لڑکا فرنچ زبان اچھی طرح جانتا ہو لیکن انگریزی زبان گنواروں کی طرح بولے تو کیا وہاں کے لوگ اس کو تعلیم یافتہ یا مہذب کہیں گے؟

سچ پوچھئے تو میں نئی نسل کے ان افراد کو بڑا بد قسمت سمجھتا ہوں کہ وہ اس انتہائی لذت اور سرور سے ناآشنا ہیں جو ہمارے ادب کے

جواہر پاروں کو پڑھ کر اور سمجھ کر انہیں حاصل ہو سکتی تھی اور جس کو وہ ہوٹلوں
اور تماشا خانوں میں بے سود تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ان سطحی اور جلد فنا
ہو جانے والی لذتوں میں وہ اسی لئے الجھے رہتے ہیں کہ ان کے سامنے
زندگی کی کوئی اعلیٰ اقدار نہیں ہیں اور وہ کوئی گہری اور دیرپا لذت
حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

غور فرمائیے کہ علم و ادب کے کیسے انمول خزانے ہیں جو ان پر ہمیشہ کے لئے
بند ہیں اور ان کی حرماں نصیبی پر افسوس کیجئے کہ سرور کی وہ کیفیت
ان کے قلب پر کبھی طاری نہیں ہو سکی جو غالب یا اقبال کے ایک شعر
پڑھنے سے کسی مرد خدا پر طاری ہو جاتی ہے۔

یہ تو ان نوجوانوں کا انفرادی نقصان ہے لیکن اس سے کہیں بڑھ کر
وہ اجتماعی نقصان ہے جو قوم اور جماعت پر ان نوجوانوں کی زندگی کے
بے کار ہو جانے کی وجہ سے عائد ہوتا ہے۔ ان کی سطحیت پسندی اور
قدیم و جدید علوم سے ناواقفیت انھیں مادیت اور الحاد کی طرف
لیجاتی ہے اور اس طرح ان کے وجود سے جماعت کو تقویت ہونے
کی بجائے اس کی جڑیں کمزور ہونے لگتی ہیں میری رائے میں
اس کی ذمہ داری ان نوجوانوں پر نہیں بلکہ ان کے والدین اور
سرپرستوں پر ہے جنھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت
صحیح اصول پر نہیں کی۔

غیر زبانیں خصوصاً یورپ کی غیر مانوس زبانیں کسی ہندوستانی بچے
کے لیے فطری طور پر آسان نہیں ہو سکتیں اور جب بچہ کو غیر زبان کے

سیکھنے میں معمولی سے زیادہ دشواریاں پیش آتی ہیں تو اس میں احساس کمزوری پیدا ہونے لگتا ہے جو نہ صرف اس ابتدائی منزل پر بلکہ نشو و نما کی آیندہ منزلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور بچہ کی ذہنی ترقی کو بڑی حد تک روک دیتا ہے۔

ایک عرصے کے مشاہدے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو لڑکا اپنی زبان اور قواعد سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے اس کے لئے غیر زبانوں کا سیکھنا بھی کافی سہل ہو جاتا ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ بچے کی تعلیمی عمر کے ابتدائی سال کلیتاً اپنی زبان کے سیکھنے کے لئے وقف ہونے چاہئیں اور کم سے کم پرائمری منزل میں یعنی تقریباً بارہ تیرہ سال کی عمر تک غیر زبان نہیں سکھانی چاہئے۔ اس طرح جو وقت بچ رہے گا وہ اپنی زبان کے اچھی طرح سیکھنے میں استعمال کیا جا سکتا ہے تاکہ کالج اور جامعہ کی تعلیم کے زمانے میں زبان کے سیکھنے پر وقت صرف نہ ہو۔ فوقانی درجوں میں غیر زبانیں سکھلائی جا سکتی ہیں لیکن اس میں بھی پہلے ہی سے ایسی زبانوں کی تعلیم کے مقصد کو معین کر لینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ہر لڑکے کو ہم کسی غیر زبان کا ادیب ماہر یا انشا پرداز نہیں بنا سکتے اور نہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ ہمارا ایک اوسط طالب علم وقت ضرورت اس زبان میں کاربراری کر سکے یعنی جامعہ کی تعلیم ختم کرنے تک اسے یہ زبان اس حد تک آجائے کہ وہ کسی علم و فن کی کتاب کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اس زبان میں خط و کتابت کر سکے۔ یہاں میرا مطلب ایک عام طالب علم سے ہے۔ ظاہر ہے کہ چند طالب علم اپنے رجحان اور مذاق کے مطابق کسی غیر زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے اور ہمارے تعلیمی نظام میں ان چند طالب علموں کے لئے بھی اپنے شوق کو پورا کرنے کا

انتظام ہونا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں غیر زبان کی موجودہ تعلیم میں بھی بڑا نقص ہے۔ اول تو ابتدائی جماعتوں ہی سے متعلم کو غیر زبان سکھائی جانے لگتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہنس کی چال چلنے جا کر اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔ غیر زبان پر وہ کیا خاک مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ اسے اپنی زبان بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ پھر کوشش ہوتی ہے کہ ہر طالب علم کو اس زبان کی ابتدا اور انتہا سب کچھ معلوم ہو جائے۔ جو لوگ اس تعلیمی نظام سے گذر چکے ہیں وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ ان کی تعلیمی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اسی غیر زبان کی نام نہاد مہارت حاصل کرنے میں صرف ہو جاتا ہے، جو زیادہ مفید طور پر کسی علم یا فن کی مہارت حاصل کرنے میں صرف ہو سکتا تھا۔ اگر اور قوموں کی مثال دینا یا ان کے نظام تعلیم سے استدلال کرنا ضروری ہی سمجھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام تمدن یافتہ قومیں اسی اصول پر عمل کرتی ہیں اور ہر ملک میں یہی قاعدہ رائج ہے کہ تمام بچوں کو ابتدا میں صرف اپنی زبان سکھائی جائے۔ ہم نے انگلستان میں کہیں نہیں دیکھا کہ پرائمری یا ثانوی مدرسوں میں تمام بچوں کو فرنچ پڑھائی جاتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لئے موجودہ حالات کے تحت بعض غیر زبانوں کا سیکھنا ناگزیر ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ تعلیم بارہ تیرہ برس کی عمر سے پہلے نہیں شروع کرنی چاہیئے اور وہ بھی اس حد تک جس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔ اس لئے ابتدائی تعلیم میں سب سے پہلے اپنی زبان اردو کے اچھی طرح سیکھنے پر زور دینا چاہیئے تاکہ پھر اس کے ذریعہ سے دوسرے علوم سکھائے جائیں اور خصوصاً مذہبی تعلیم دی جا سکے۔ پھر بارہ تیرہ برس کی عمر سے سترہ اٹھارہ برس کی

عمر تک اردو، فارسی اور عربی بھی پڑھائی جا سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اب عربی فارسی میں پر توجہ کرنا چھوڑ دیا ہے اور بہت کم مسلمان بچے یہ زبانیں سیکھتے ہیں۔ اگر عربی کے مشکل ہونے کا عذر ہے تو فارسی تو بہر حال کچھ زیادہ مشکل نہیں اور آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ خود ہماری زبان اردو کا ان زبانوں سے گہرا تعلق ہے اور پھر ہماری مذہبی اور قومی تاریخ ان زبانوں سے وابستہ ہے۔ ان زبانوں میں وہ ادب موجود ہے جو ایک مسلمان کے ایمان کو استوار اور پختہ کر سکتا ہے۔

غرض ثانوی منزل کے ختم کرنے تک یعنی سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک ہر طالب علم کو اپنی زبان اس قدر اچھے طور پر آنی چاہیئے کہ وہ اس زبان میں لکھی ہوئی کسی عام فہم کتاب کو پڑھ کر کماحقہ، سمجھ سکے۔ اسی منزل پر ہر مسلمان طالب علم کے لئے لازم ہونا چاہیئے کہ وہ اسلامی عقائد اور شریعت کے بنیادی اصول سے اچھی طرح واقف ہو۔ تاریخ اسلام کا بخوبی مطالعہ کر چکا ہو اور تفسیر و حدیث سے بھی ایک حد تک آگاہی رکھتا ہو۔ جو مسلمان بچے اقتصادی یا معاشی مجبوری کی وجہ سے پرائمری منزل پر یعنی بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں اپنی تعلیم ختم کر دیں وہ اردو اس حد تک سیکھیں کہ معمولی روزمرہ کا کاروبار چلا سکیں یعنی صحیح اردو بول سکیں، پڑھ سکیں اور لکھ سکیں اور ضروری خط و کتابت، حساب کتاب کر لیں۔ اسی کے ساتھ ان کو دینیات کی تعلیم بھی دی جائے جس میں قرآن مجید کا ایک حصہ ناظرہ کے طور پر پڑھایا جائے لیکن اس کے ساتھ استاد ان آیتوں کے معنی بھی سادہ زبان میں بتلا دے۔ ایمان، نماز روزہ زکوٰۃ اور حج کے ضروری اور اہم امور سمجھائے جائیں۔ رسول اللہ

خلفائے راشدین اور مشاہیر اسلام کی زندگی کے اہم واقعات سے واقف کرایا جائے اور اصول اخلاق ذہن نشین کرائے جائیں۔

میں نے صفحہ (۷۰) پر جو تفصیلی نصاب تعلیم ابتدائی اور ثانوی منزلوں کا پیش کیا ہے اس میں ان تجویزوں کا مکمل اور منظم خاکہ مل جائے گا۔ میں نے مثال کے طور پر صرف مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا نصاب بنانے کی کوشش کی ہے۔ کسی دوسرے مذہب کے پیرو اس کے بجائے اپنی اپنی مذہبی تعلیم کا نصاب معین کر سکتے ہیں۔

مذہب اور دینیات کی اس تعلیم کے لئے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ ان مضامین یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ اسلام وغیرہ پر مختلف مدارج کی متعدد آسان کتابیں اردو میں یا ضرورت ہو تو مقامی زبانوں میں صحیح نقطۂ نظر سے لکھوا کر نہایت سستے داموں فروخت کرنے کا انتظام کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ ہر مسلمان بچہ موجودہ سرکاری مدرسوں میں ان کتابوں کو نصاب کے طور پر لازماً پڑھے۔ اگر حالات حاضرہ کے تحت کسی وجہ سے موجودہ سرکاری مدرسوں میں ان مضامین کی تعلیم ممکن نہیں تو مسلمان علیحدہ طور پر تعطیلوں میں یا فرصت کے اوقات میں ان مضامین کی تعلیم کا انتظام کریں۔ ایک مرکزی تنظیم جس کی شاخیں ہر صوبہ، ضلع اور شہر میں ہوں شبینہ مدرسے اور تعطیلوں میں درس دینے والے مدرسے کھولے جن میں ان مسلمان بچوں کو جو سرکاری مدرسے میں دینیاتی مضامین پڑھنے سے محروم ہیں ان مضامین کی اچھی طرح تعلیم دی جائے اور اس تعلیم کے ختم پر امتحان لے کر ایک سند عطا کی جائے۔ اگر کوئی مسلمان بچہ کسی

سرکاری مدرسہ میں اس قسم کی دینیاتی تعلیم پاچکا ہو اور اس میں سرکاری امتحان دے چکا ہو تو اسے مستثنیٰ کر دیا جائے ورنہ اٹھارہ برس کے ہر مسلمان نوجوان پر لازم کر دیا جائے کہ وہ مرکزی اسلامی تنظیم کے کسی مدرسے میں یہ مضامین فرصت کے اوقات میں پڑھے امتحان میں شریک ہو اور کامیابی کی سند حاصل کرے۔

میں اس وقت صرف ایک ابتدائی تجویز اور اس کا سرسری خاکہ پیش کر رہا ہوں، تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے اور بہرحال ماہرین کی ایک مستند جماعت ہی تفصیلات پر غور کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس تجویز کو بروئے عمل لانے میں بہت سی دقتیں محسوس ہوں لیکن محض مشکلوں کے تصور سے اہم کام کو پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ مدبرانہ طور پر ان مشکلات کا حل دریافت کیا جائے۔ جہاں کہیں ممکن ہو وہاں قانون کے ذریعہ اور جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں رائے عامہ کے ذریعہ مسلمانوں پر یہ لازم کیا جائے کہ وہ اپنی زبان، مذہب اور تمدن سے پوری طرح واقف ہوں۔

انفرادی آزادی اور رواداری کا ماحول صرف ایک حد تک درست اور قابل عمل ہوتا ہے اور اس حد سے گزر جائے تو نہ صرف نقصان دہ بلکہ مہلک بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح کم سمجھ بچوں اور بیماروں کو دوا اور پرہیز کے بارے میں مجبور کیا جا سکتا ہے اسی طرح نوجوانوں کو اپنے مذہبی اور تمدنی اصول سے واقفیت پر مجبور کرنا ناگزیر ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اجتماعی زندگی سخت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اگر عام لوگ مذہبی اور قومی شعور کی اہمیت کو سمجھ لیں اور مذکورہ بالا دینیاتی تعلیم کی سند کو

سرکاری تعلیم کی سند کی طرح ہر نوجوان کے لئے لازمی قرار دیں، خانگی صحبتوں میں، آپس کے کاروبار میں، شادی بیاہ کے موقع پر اور اجتماعی امور میں انہی نوجوانوں کو ترجیح دیں جو مذہبی تعلیم پا چکے ہوں تو حکومت کی سرپرستی نہ ہونے کے باوجود بھی بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

---

(۹) اعلیٰ تعلیم

اب میں دوسرے جزو علم کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور غور کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوانوں کی اعلیٰ یعنی جامعاتی تعلیم کیسی ہونی چاہیئے۔ اس بارے میں بھی پہلے موجودہ حالت کا جائزہ لوں گا اور اس کے بعد اپنی تجویزیں پیش کروں گا۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ انسانوں کی سماجی اور معاشرتی ضروریات اور مفاد کے لحاظ سے یہ عمرانی علوم سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ مضامین یعنی تاریخ معاشیات عمرانیات وغیرہ ابھی تک حقیقی علمی یعنی سائنسی حیثیت حاصل نہیں کر سکے اور اس لیے سخت ضرورت ہے کہ ماہرین کی ایک جماعت ان مضامین کو حقیقی علمی حیثیت سے مدون کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ ایسے ماہروں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ اس تدوین کی خاطر ابتدائی تیاری میں صرف کردیں۔ علم کی وحدت کے بیان میں بتلایا جاچکا ہے کہ عمرانی علوم نفسیاتی علوم پر منحصر ہیں۔ نفسیاتی علوم حیاتی علوم پر منحصر ہیں اور حیاتی علوم طبیعی علوم پر منحصر ہیں اس لئے جو لوگ عمرانی علوم پر اعلیٰ درجہ کا تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں اور ان مضامین کو سائنسی طور پر مدون کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ اگر

طبیعی نہیں تو کم از کم نفسیاتی اور حیاتی علوم اچھی طرح سیکھیں اور پھر تاریخ معاشیات عمرانیات وغیرہ کا مطالعہ کریں اور ان کی سائنسی تدوین کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک صبر آزما اور وقت طلب کام ہے اور اس کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے۔ اس نہایت ہی اہم کام کے لئے جامعات میں تحقیقی شعبے ہونے چاہئیں جن میں وہی ریسرچ اسکالر داخل کئے جائیں جو حیاتی اور نفسیاتی علوم کافی حد تک سیکھ چکے ہوں اور جو امتحان کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقے سے اس کا ثبوت دے چکے ہوں کہ وہ ان عمرانی علوم میں تحقیق کرنے اور ان علوم کی سائنسی تدوین کرنے کی بخوبی قابلیت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان ریسرچ اسکالروں کو معقول تنخواہ دی جانی چاہئے تاکہ وہ ملازمت یا روزگار کی تلاش میں نہ رہیں اور اپنی ساری عمر ان علوم کی باضابطہ تدوین کے لیے وقف کردیں۔

لیکن عمرانی علوم کی باضابطہ سائنسی تحقیق و تدوین ایک طویل المعیاد لائحہ عمل ہے اور یہ زمانہ میکانی سائنسوں اور مشینوں کا ہے۔ اس مشینی دور میں ہماری فوری ضرورت اور زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اپنی زیادہ توجہ عملی سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف مبذول کریں۔ اس زمانے میں نہ صرف افراد کا بلکہ قوموں کا جینا مرنا مشینوں کی طاقت پر منحصر ہے۔ یہ اخلاقی بحث اب بے سود ہے کہ ایسا ہونا چاہئے یا نہیں یعنی انسان کو مشینوں کا غلام بننا چاہئے یا نہیں۔ جب مشینوں کا وجود اور ان کا استعمال

امرِ واقعہ ہے تو ہمیں اس واقعہ سے نبٹنا چاہیئے اور اس لئے جہاں تک ہو سکے ہمارے افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو ہر قسم کی چھوٹی بڑی مشینوں کا بنانا، انہیں درست کرنا اور چلانا سیکھنا چاہیئے۔ ورنہ کیا ہم مشینوں کا جواب شعر و سخن کی گرم رفتاری یا قانون اور فلسفہ کی چرب زبانی سے دیں گے؟ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ دوسری قومیں قدرت کی قوتوں پر قابو حاصل کرنے کی کوششوں میں ہم سے کس قدر آگے ہیں اور آگے بڑھتی جا رہی ہیں، کیا ہم ان ہی کے مقابلے میں اپنی آزاد حیثیت کو منوانا نہیں چاہتے؟ پھر علم و حکمت میں ان سے کم رہ کر کس طرح ہم اپنی آزاد حیثیت کو منوا لینے اور اس کو باقی رکھنے کی توقع کر سکتے ہیں۔ اس جدید کشمکشِ حیات میں موثر علم وہی ہے جس سے قدرت کی قوتوں پر قابو حاصل کیا جائے۔ مشینوں کو ہم چاہے کتنی بڑی لعنت ہی کیوں نہ تصور کریں لیکن جب دور دورہ ہی مشینوں کا ہے تو ان پر قابو حاصل کئے بغیر چارہ نہیں۔ ورنہ اپنی آزاد حیثیت کو منوانا اور باقی رکھنا تو کجا مرنے کے بعد بھی کفن اور دفن کے سامان کے لئے غیروں کے محتاج رہیں گے۔

ہمارے نوجوانوں میں عام طور پر زبان اور ادب وغیرہ فنون کے مضامین کی تعلیم حاصل کرنے کا جو عام رجحان پایا جاتا ہے اس کے محرکات پر غور فرمائیے۔ شہرت اور عزت کی خواہش ہر فرد بشر کے دل میں کم و بیش ہوتی ہے اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے ہم چشموں میں ممتاز حیثیت حاصل کرے۔ اب شہرت اور امتیاز حاصل کرنے کے چند محدود طریقے ہیں مثلاً حکومت،

دولت اور علم و فن میں کمال۔ ان کے علاوہ ممکن ہے دو ایک طریقے اور ہوں۔ معاشرہ کے موجودہ نظام میں دولت اور حکومت بہت کم افراد کے حصے میں آتی ہیں۔ اس لئے شہرت اور عزت کے متلاشی نوجوانوں کو دوسرے ذرائع کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی علم یا فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے صبر و استقلال کے ساتھ طویل عرصے تک محنتِ شاقہ برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مشکل پسندی اور محنت و مشقت کی طرف بہت کم لوگ راغب ہوتے ہیں۔ ان کی آرام طلبی ان کا نصب العین بھی پست کر دیتی ہے یعنی وہ حقیقی عزت و احترام کی بجائے وقتیہ شہرت، ہر دلعزیزی اور نام و نمود پر قانع ہو جاتے ہیں۔ پھر پست نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے وہ راستہ بھی وہی اختیار کرتے ہیں جس میں مزاحمت کم سے کم ہو۔ چنانچہ جب وہ اپنے گرد و پیش نظر ڈالتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ خانگی اور سماجی محفلوں میں آؤ بھگت ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنی شاعری یا لفاظی سے محفل کو گرما سکیں۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں بے تحاشا بولنے والوں کو پیش پیش رکھا جاتا ہے خواہ چرب زبانی کے اس مظاہرے میں کتنی ہی سطحیت کیوں نہ ہو۔ قابلیت اور محنت سے لکھے ہوئے علمی مقالے کو سننے کے لئے لوگ اس قدر شوق سے جمع نہیں ہوتے جیسے مشاعروں کے لئے جوق جوق چلے آتے ہیں۔ سول سروس میں یا اعلیٰ عہدوں پر تقرروں میں بھی اکثر انہی نوجوانوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو لکھنے اور بولنے کا اچھا مظاہرہ کر سکیں۔ غرض ملک کی فضا حقیقی علم کی نہیں

بلکہ سطحیت اور نام ونمود کی پرورش کرتی ہے اس لئے نوجوان عام طور پر وہی مضمون پڑھنا چاہتے ہیں جن سے یہ وقتیہ شہرت، ہر دلعزیزی اور عہدے حاصل کرنے میں مدد ملے یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی میں ہمارے طالب علموں کی بہت کم تعداد سائنس کے مضامین کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس عام رجحان پر غالب آنے کے لئے ضروری ہے کہ اہل ملک کی ذہنیت حقیقی معنوں میں سائنسی ہو اور لوگ سطحی باتوں سے مرعوب نہ ہوں۔

غرض کالجوں اور جامعات میں ہم اکثر طلبہ کو زبان، ادب وغیرہ فنون کے مضامین کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بہت کم طلبہ اعلیٰ سائنسوں اور ٹکنیکل مضامین کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں شاعر، افسانہ نویس اور لیڈر تو بہت نکلتے ہیں لیکن سائنس دان انجینیر خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ فنون کے مضامین کی تحقیر کروں بلکہ میرے دل میں ان کی بہت وقعت ہے۔ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ انسانوں کی تمدنی ضرورت اور مفاد کے لحاظ سے یہ علوم اہم ترین ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کو خواہ وہ سائنس داں یا انجینیر ہی کیوں نہ ہو، تاریخ، ادب، قانون اور فلسفہ وغیرہ کی اتنی معلومات ضرور حاصل کرنی چاہئے جتنی ان مضمونوں کے ایک اوسط گریجویٹ کو حاصل ہوتی ہیں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کے لئے اس قدر معلومات اپنی فرصت کے اوقات میں حاصل کرنا اچھی طرح ممکن ہے۔ یہاں میں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اس وقت جامعات میں ہمارے نوجوانوں کی بڑی

تعداد زبان اور ادب وغیرہ فنون کے مضامین کی تعلیم حاصل کرے یا سائنس، ٹکنالوجی، طب اور صنعت وحرفت میں مہارت حاصل کرے۔ سب سے پہلے اس سوال پر غور کیجئے کہ جس طرح فنون کے مضامین اس وقت عام طور پر پڑھائے جاتے ہیں ان مضامین میں بی۔ اے کی حد تک معلومات حاصل کرنے کے لئے کیا جامعہ کی تعلیم کے چار پانچ سال وقف کرنا ضروری ہے۔ کیا یہ معلومات ایک اوسط دل و دماغ کے انسان کو خانگی طور پر فرصت کے اوقات میں مطالعہ سے نہیں حاصل ہو سکتیں؟۔ قدیم زمانے کا تو کیا ذکر ہے کیا خود موجودہ زمانے کے بڑے بڑے ادیب اور انشاپرداز سب کے سب یا بڑی تعداد میں جامعات کے ڈگری یافتہ ہی ہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہر ملک کے تمام نہیں تو اکثر ادیبوں شاعروں اور مضمون نگاروں نے جامعات کے باہر رہ کر بھی بقائے دوام حاصل کی ہے؟ اس بیان سے میرا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ جامعات میں تاریخ، ادب اور زبان وغیرہ کی تعلیم اور تحقیق کا انتظام نہ کیا جائے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ہر علم و فن کے لئے پورا انتظام ہونا چاہئے تاکہ اگر معدودے چند افراد بھی کسی علم سے واقعی ذوق یا شغف رکھتے ہیں تو وہ اپنے شوق کی تکمیل کر سکیں۔ مجھے جو کچھ اختلاف ہے وہ اس امر سے ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد اپنی سیکھنے اور سمجھنے کی عمر بنجر پر قابو حاصل کرنے کی ترکیبوں سے واقف ہونے اور ان کو دریافت کرنے کی بجائے سکندر اعظم کی زندگی کے واقعات پڑھنے یا گجرات میں کسی

زبان کے ارتقا کا بیان پڑھنے میں صرف کردے۔ بیشک سکندر اعظم کے واقعات اور زبان کے ارتقا کا علم بھی ایک مہذب انسان کے لئے ضروری ہے۔ لیکن کیا گھر میں بیٹھے ہوئے فرصت کے اوقات میں ماہرین کی کتابیں پڑھ کر ہم یہ معلومات حاصل نہیں کر سکتے؟ مدرسے کی تعلیم کا اس کے علاوہ اور کیا مقصد ہوتا ہے کہ ہمیں اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کے قابل بنا دے؟ مدرسے کی تعلیم کو ختم کرنے کے بعد بھی اگر ایک طالب علم اپنی زبان میں لکھا ہوا ادب، زبان وغیرہ فنون کے مضامین کی کتابیں خود پڑھ کر سمجھ نہ سکے تو پھر مدرسے کی ساری تعلیم سے کیا حاصل؟ البتہ چند لوگ جو ان علوم سے حقیقی شوق رکھتے ہیں اور جو ان میں تحقیق کرنے اور اضافہ کرنے کی خواہش اور صلاحیت رکھتے ہیں وہ جامعات میں ضرور ان چیزوں کی طرف رجوع ہوں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی اور استادوں، والدین، ارباب جامعہ اور حکومت کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ان علوم سے واقعی دلچسپی رکھنے اور ان میں تحقیقی کام کرنے کی صلاحیت رکھنے والوں کو پہچاننے کے طریقے معلوم کریں اور سوائے ایسے طالبعلموں کے دوسروں کو ان جامعتوں میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں۔

افراد کی طرح اقوام کی زندگی کا بھی یہ ناقابل انکار اصول ہے کہ پہلے ضروریات زندگی کی تکمیل کی جائے اور جب ضروریات کے تمام سامان مہیا ہو جائیں تو پھر عیش و عشرت کے سامان کی فراہمی کی طرف رجوع کرنا جائز ہے۔ اس وقت شعر و سخن ہمارے لئے ذہنی تعیش

سے زیادہ نہیں۔ سوائے ان صورتوں کے جن میں شاعری سے پیغمبری کا کام لیا جائے۔ ہمارے بقا تحفظ اور ترقی کے لئے سائینس اور ٹکنالوجی فوری ضروریات میں داخل ہیں اگر ہم اب بھی ان کی اہمیت نہیں سمجھیں گے تو پھر زمانہ خود ہم سے سمجھ لے گا۔

کہیں کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ چونکہ میں خود سائنس کا ایک طالب علم ہوں اس لئے فنون کے مقابلے میں سائنس کی اہمیت کو جتا رہا ہوں۔ اکبر مرحوم کے متعلق تو یقیناً کسی کو اس قسم کی جانب داری کا شبہہ نہیں ہوسکتا اس کے علاوہ سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ مغربی تہذیب سے بھی بالکل مرعوب نہیں تھے۔ اب دیکھئے وہ ہماری تعلیم کے متعلق کیا کہتے ہیں اور جو لوگ محض زبان و ادب کی تعلیم میں محو رہتے ہیں ان کو ترقی یافتہ قوموں کی زبان کیا سناتے ہیں۔

"شیخ صاحب کو ہے بڑا دعویٰ اونٹ کے سو لغات جانتے ہیں

ہیں مگر اونٹ پر ہمیں قابض کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں"

اونٹ پر یہ قبضہ کس طرح ہوسکتا ہے اس کا گر بھی حضرت اکبر نے بتا دیا ہے :۔

"تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف
نیچر کی جو طاقتوں کو کردیں مکشوف"

غرض میں اس امر پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوانوں کا یونیورسٹی میں فنون کے مضامین میں بی۔ اے کرنا نہ صرف ان کا انفرادی نقصان ہے

بلکہ قومی نقصان بھی ہے۔ انفرادی نقصان اس طرح کہ جو معلومات وہ خود اپنے طور پر فرصت کے اوقات میں حاصل کر سکتے تھے وہی معلومات انھوں نے یونیورسٹی میں حاصل کیں حالانکہ اس زمانے میں وہ یونیورسٹی میں سائنس یا ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کر سکتے تھے جو خانگی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی۔ قومی نقصان اس طرح کہ اگر یہی نوجوان یونیورسٹی میں سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرتے جو خانگی طور پر محال ہے تو ان میں سے کئی ایک افراد کی ایجادوں سے ملک اور قوم اور بنی نوع کو فائدہ ہوتا۔

پھر فنون (ARTS) کے مضامین کی ان معلومات کو حاصل کرنے کے لئے جو ایک اوسط گراجویٹ میں پائی جاتی ہیں اچھے کتب خانوں کا وجود کافی ہے جہاں سے کوئی شخص معیاری کتابیں کافی تعداد میں گھر لے جا کر اپنی فرصت کے اوقات میں مطالعہ کر سکے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فنون کے مضامین کے ایک اوسط طیلسانی کو پیدا کرنے کے لئے یونیورسٹی کی تعلیم کی قطعی ضرورت نہیں۔ اگر یہ تعلیم ضروری ہوتی تو پھر Bertrand Russell اور H.G. Wells جیسے مفکرین کے لئے کیسے ممکن ہوتا کہ یونیورسٹی میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تاریخ، معاشیات، عمرانیات وغیرہ مضامین میں اعلیٰ پایہ کی کتابیں تصنیف کر سکیں؟ اس لئے یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق ہماری قوم کو یہ اصول بنانا چاہئے کہ صرف ان معدودے چند طلبہ کو جو خاص رجحان اور صلاحیت ثابت کر سکیں فنون کے مضامین لینے کی اجازت دی جائے اور باقی

تمام طلبہ کو سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب بلکہ مجبور کیا جائے۔ ہماری سب سے بڑی ضرورت اس وقت یہ ہے کہ ہم میں سائنس اور انجنیری جاننے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں موجود ہوں تاکہ انہی میں سے ماہرین کی ایک جماعت نکل سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں ماہرین سائنس کی تعداد اتنی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے اور جو کچھ ہیں بھی تو وہ ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں۔

ممکن ہے یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ بہت سے طلبہ میں سائنس پڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور نہ وہ سائنس سے دلچسپی رکھتے ہیں پھر انھیں کس طرح سائنس کے مضامین پڑھنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال بھی ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اول تو میٹرک تک سائنس پڑھائی ہی نہیں جاتی یا اگر پڑھائی جاتی ہے تو یہ تعلیم بالکل ابتدائی باتوں تک محدود ہوتی ہے۔ پھر کیسے قیاس کر لیا گیا کہ عام طلبہ کو سائنس سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ کیا کسی علم کی مبادیات بھی کبھی دلچسپ ہوتی ہیں؟ خود اپنی مادری زبان کو لیجئے۔ ہم نے آج تک ایک انسان بھی ایسا نہیں دیکھا جس پر الف ب سیکھتے وقت یا گردانیں یاد کرتے وقت ذوق و شوق کے مارے جذب اور وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہو۔ تو پھر چونکہ قواعد اردو ہر بچے کے لئے غیر دلچسپ ہوتی ہے کیا اسے اپنی زبان سیکھنے سے دست بردار ہو جانا چاہئے؟ یہی حال ابتدائی سائنس کا ہے جو دراصل سائنس کی قواعد ہے۔ اس ابتدائی سائنس میں سے گزرنے کے بعد اعلیٰ سائنس اتنی ہی دلچسپ ہو جاتی ہے جیسی قواعد اردو میں سے گزرنے

کے بعد نذیر احمد اور حالی کی کتابیں۔

بہر حال ہمیں ہر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو ہمارے نوجوانوں میں سائنسی اور فنی تعلیم کو فروغ دے اور سائنس کے گراجویٹ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نکلنے لگیں کیونکہ ان ہی گراجویٹوں میں سے سائنس کے ماہرین اور موجد پیدا ہو سکتے ہیں اور جتنی زیادہ تعداد میں سائنس کے طالب علم آنے لگیں گے اسی قدر ایسے ماہروں اور موجدوں کے پیدا ہونے کا امکان بڑھتا جائے گا اس حقیقت سے شاید ہی کوئی سمجھ دار شخص اب انکار کرے گا کہ اعلیٰ تعلیم کی منزل میں ہماری قوم کو اس وقت فنون کے مضامین کے مقابلے میں سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت کی بے انتہا زیادہ ضرورت ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ہر اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کو اپنی فرصت کے اوقات میں فنون کے مضامین کی بنیادی معلومات حاصل کرنی چاہئیں جو ایک متمدن انسان اور مہذب شہری کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن یونیورسٹی میں تو معدودے چند افراد کے سوا باقی سب کو سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ سائنٹفک تعلیم خانگی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ صرف بڑے منظم اداروں یعنی یونیورسٹیوں اور ٹکنیکل کالجوں ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے افراد اور ہماری جماعتیں وقت کی اس فوری ضرورت سے اب بھی پوری طرح واقف نہیں اور نہیں جانتے کہ ان کی یہ غفلت ان کے لئے کس قدر خطرناک ہے۔ ہماری مرکزی تنظیموں اور دولت مند اور سرمایہ دار اصحاب خیر کو اس اہم ترین تعمیری کام کی طرف

فوری توجہ کرنی چاہئے کہ نوجوانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو ہر قسم کی سائنس اور ٹکنالوجی کا ماہر بنائیں۔ اس کے لئے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ محض کالجوں میں بی۔ایس سی یا ایم۔ایس سی تک سائنس کی نصابی تعلیم ختم کرنے سے مہارت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اصل اور کارآمد تعلیم کی ابتدا تو ایم۔ایس سی کے بعد میں ہوتی ہے۔ اس لئے قابل اور صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کو فکر معیشت سے بے نیاز کر دینا چاہئے تاکہ وہ سائنسی اور فنی مہارت حاصل کرنے اور تحقیقات کرنے میں منہمک رہیں۔ اگر موجودہ سائنٹفک اور ٹکنیکل اداروں میں نوجوانوں کو کافی تعداد میں کماحقہ مہارت حاصل کرنے کا موقع نہ ہو تو مرکزی تنظیموں کو خود ایسے ادارے اور تربیت گاہیں مہیا کرنی چاہئیں اور جو پیسہ عموماً شعر و سخن کے لئے یا کانفرنسوں اور انجمنوں میں نام و نمود کی خاطر خرچ کیا جاتا ہے وہ ان سائنٹفک اداروں پر لگا دینا چاہئے۔ اب بیکار بیٹھنے یا کانفرنسیں کرتے رہنے کی مہلت نہیں بلکہ یہ تعمیری کام فوراً شروع کر دینا چاہئے یعنی نوجوانوں کے ایمان کو مستحکم کرنے اور انھیں علم اور خصوصاً سائنٹفک اور ٹکنیکل علم کی قوت سے مسلح کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

---

(۱۰) تعلیمی منزلیں اور نصاب

---

(۲) ابتدائی (پرائمری) تعلیم   مدت تعلیم ۷ سال۔ عمر ۵-۶ تا ۱۲-۱۳ سال

۱) اردو

۲) حساب

۳) دنیا کی تاریخی کہانیاں مع جغرافیہ۔

۴) مطالعۂ قدرت و اصول حفظان صحت۔

۵) ہنر اور فن کاری بشمول نقشہ کشی (ڈرائنگ)۔

۶) دینیات

۷) زبان دوم (ہندوستان کی مختلف صوبجاتی زبانوں میں سے کوئی ایک زبان یا عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی میں سے کوئی ایک زبان)۔ یہ اختیاری مضمون ہوگا۔

۸) ورزش جسمانی۔

نوٹ:۔ ابتدائی تعلیم سے قبل بچوں کو تین برس کی عمر سے پانچ چھ برس کی عمر تک Nursery School اور Kinder — Garten میں تربیت دی جانی چاہئے اور اس کا انتظام ماہرین تعلیم و تربیت کے سپرد ہونا چاہئے۔

ذیل کی تشریح سے اس ابتدائی تعلیم کے نصاب اور مدت تعلیم وغیرہ کے متعلق ضروری امور واضح ہو جائیں گے۔

۱) **اردو**:۔ معمولی روزمرہ کے کاروبار کی حد تک لکھنا پڑھنا اور صاف اور صحیح زبان بولنا۔ اردو زبان میں لکھی ہوئی آسان ابتدائی کتابیں پڑھنا اور سمجھ لینا۔ ضروری خط وکتابت کرنا۔

۲) **حساب**:۔ جمع، تفریق، ضرب، تقسیم، سادہ کسریں، معمولی کاروباری حساب، رقموں کی داد وستد، خرید وفروخت میں منافع اور نقصان، اوسط اور فیصدی، مختلف اوزان اور پیمانے جو عام طور پر رائج ہیں۔ مثلثوں اور مستطیلوں کا رقبہ۔

۳) **تاریخ وجغرافیہ**:۔ دنیا کی تاریخ کہانیوں کی شکل میں جس کے ذریعہ بچہ کے ذہن میں انسانوں کی وحدت اور اقوام عالم کی برادری کا تصور جمایا جائے۔ اس تاریخ کے ساتھ دنیا کے جغرافیہ کی موٹی موٹی باتیں بھی بتائی جائیں اپنے ملک کی تاریخ اور اس کا جغرافیہ بھی اسی ضمن میں بتائے جائیں۔

۴) **مطالعۂ قدرت اور اصول حفظان صحت**:۔ دنیا کی مختلف بے جان اور جان دار اشیاء کے متعلق ابتدائی مشاہدات اور معلومات، صحت کے ضروری اصول۔

۵) **ہنر اور فن کاری**:۔ اس میں ڈرائنگ بھی شامل ہو۔

۶) **دینیات**:۔ (ا) قرآن مجید کے ایک حصہ کا ناظرہ۔ ضروری نہیں کہ قرآن مجید کا یہ حصہ مکمل اور سلسلہ وار سوروں یا پاروں

پر مشتمل ہو بلکہ پوری قرآن مجید میں سے مناسب اور موزوں انتخاب کیا جائے۔ آیتوں کے سادہ معنی بھی سلیس زبان میں بیان کئے جائیں۔ چند چھوٹے سوروں کو حفظ کروایا جائے۔ (ب)۔ ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضروری اور اہم امور (ج) رسول اللہؐ خلفائے راشدینؓ اور مشاہیر اسلام کے حالات۔ (د)۔ مبادئ اخلاق۔

نوٹ:۔ غیر مسلم بچوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کی تعلیم کا نصاب اس کے مماثل تیار کیا جاسکتا ہے۔

۷) **زبان دوم** (ہندوستان کی کوئی صوبجاتی زبان یا عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی میں سے کوئی ایک)۔ ان بچوں کے لئے جو ثانوی تعلیم پانا چاہتے ہوں ابتدائی منزل کے آخری تین سالوں میں لازم ہوگا کہ کوئی زبان دوم سیکھیں۔ نصب العین یہی ہوگا کہ ہر بچہ ضروری ثانوی تعلیم حاصل کرے لیکن بحالت موجودہ اگر بعض مجبوریوں کی بناء پر کوئی بچہ ابتدائی تعلیم سے آگے نہ بڑھ سکے یعنی ثانوی تعلیم نہ پا سکے تو وہ آخری تین سال میں زبان دوم کی بجائے زراعت یا مشینوں کا کام سیکھے یا کسی پیشے کی عملی تربیت حاصل کرے جو اس مقام پر یا مدرسے میں ممکن ہو اور اس کے ساتھ اپنے صوبے کی بول چال بھی سیکھے۔ اسی طرح اگر کوئی لڑکی ابتدائی منزل پر ہی اپنی تعلیم ختم کرنے کے لئے ناگزیر وجوہ کی بناء پر مجبور ہو تو آخری تین سالوں میں فن کاری اور ہنر کے ساتھ ساتھ اس کو امور خانہ داری کی تعلیم

وتربیت دی جاسکتی ہے

ہر لڑکے اور لڑکی کو چاہئے وہ کسی غریب سے غریب مزدور یا کسان کی اولاد یا یتیم اور بے کس ہی کیوں نہ ہو حکومت کی جانب سے ابتدائی تعلیم لازماً دینی چاہئے۔ متعلمین پر تعلیم کا کوئی بار عاید نہیں ہونا چاہئے اور جن بچوں کا کوئی سرپرست نہ ہو یا اُن کے سرپرست کی آمدنی ایک خاص معینہ اقل ترین مقدار سے کم ہو ان بچوں کے لئے دوران تعلیم میں حکومت کی جانب سے رہنے اور کھانے کپڑے کا انتظام ہونا چاہئے۔ پھر ابتدائی منزل کے ختم ہونے پر ان میں سے جو بچے اپنی علمی اور ذہنی قابلیت اور صلاحیت کا اطمینان بخش ثبوت دیں ان کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام بھی حکومت کی طرف سے ہونا چاہئے۔

اگرچہ اب بھی بعض طلبہ کی فیس معاف ہوتی ہے اور بعض کو وظیفۂ تعلیمی یا رعایتی ملتا ہے لیکن یہ عمل درآمد جس اصول پر ہوتا ہے وہ اصول ہی سرے سے غلط ہے۔ موجودہ عمل درآمد یہ ہے کہ پہلے ہی سے معافی فیس اور وظیفہ پانے والوں کی تعداد معین کر دی جاتی ہے اور اس سے زیادہ تعداد کو نہ صرف معافی اور وظیفہ سے بلکہ نتیجتاً تعلیم سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بجائے میری رائے ہے کہ معافی فیس اور وظیفہ کی تعداد کو پہلے ہی سے معین نہیں کرنا چاہئے بلکہ جتنے بھی واقعی مستحق طالب علم نظر آئیں ان سب کو تعلیم کی تمام سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دس بارہ برس کے یہ بچے جنھیں غربت اور فلاکت کے باعث تعلیم پانے سے

محروم کیا جارہا ہے ان میں سے کتنے موجد و منکشف اور عالم و ماہر نکلیں گے۔

اس کے لئے اگر حکومت کو آمدنی کی کمی کا عذر ہے اور اگر یہ کمی کسی اور مناسب ذریعہ سے پوری نہیں کی جاسکتی تو استطاعت رکھنے والے شہریوں پر ایک تعلیمی ٹیکس اسی طرح عاید کیا جاسکتا ہے جس طرح انکم ٹیکس یا پانی پر ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ذہن اور روح کی تربیت جسم کی تربیت سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی اور اس کے لئے اگر حکومت کا نہ صرف اخلاقی بلکہ قانونی فرض ہے کہ وہ تمام شہریوں کے لئے جسمانی غذا کا انتظام کرے تو ذہنی اور روحانی غذا کا انتظام بھی اسی طرح قانونی فرض ہونا چاہئے۔

میں جانتا ہوں کہ تمام شہریوں کو کما حقہٗ تعلیم و تربیت دینے میں حکومت کو بہت زیادہ اخراجات عاید ہوں گے اور شائد ہندوستان جیسے غریب ملک میں اس قدر آمدنی فراہم کرنا نہایت مشکل ہوگا۔ لیکن خدا کے فضل سے انسانوں کی سمجھ اور تدبر کا دیوالہ اس قدر نہیں نکلا ہے کہ وہ ان مشکلات کا کوئی حل سوائے اس کے دریافت نہ کرسکیں کہ شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو جاہل اور ان پڑھ رہنے دیں۔ تعلیم کے مسئلے کو اقتصادی اور معاشرتی مسئلوں کے تابع کبھی نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر کسی بیرونی دشمن کے حملہ کا خوف پیدا ہو یا اندرونی فساد کا کوئی اندیشہ ہو تو کوئی ملک یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے موازنہ میں گنجائش ہے یا نہیں بلکہ بلا توقف فوج اور پولیس کا زیادہ سے زیادہ انتظام کیا جاتا ہے۔ تاکہ ملک کی مدافعت اور حفاظت بطریق احسن ہوسکے۔ اس مقصد کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے

اور ہر ممکنہ تدبیر اختیار کی جاتی ہے کہ ضروری رقم فراہم کی جائے۔ جہالت اور پستی بھی کسی قوم اور ملک کے اتنے ہی خطرناک دشمن ہوتے ہیں جتنے کہ بیرونی حملہ آور اور ان کے ازالہ کے لئے بھی ضروری تدبیریں اسی طرح اختیار کی جانی چاہئیں جس طرح ایک بیرونی دشمن سے مدافعت اور حفاظت کے لئے کی جاتی ہیں۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ابتدائی سے لے کر اعلیٰ جامعاتی منزل تک ساری تعلیم ان تمام شہریوں کے لئے جو اس کو حاصل کرنے کی صلاحیت اور قابلیت رکھتے ہیں، مفت ہونی چاہئے۔ جو تعلیمی ادارے لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں ان کے اخراجات میں متعلمین سے چند ہزار روپے فیس کے طور پر وصول کرنے سے کوئی خاص تخفیف نہیں ہوتی تعلیم و تربیت پائے ہوئے نوجوانوں کا وجود خود معاشرہ کی بقا اور ترقی کے لئے ناگزیر ہے اور یہ بڑی ناانصافی ہے کہ معاشرہ خود اپنے بقا اور ارتقا کے لئے ان نوجوانوں پر اخراجات کا بار عاید کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے گویا کہ ایک مشین ان کل پرزوں سے جن کی بدولت وہ چلتی ہے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اس مشین کو چلانے کے قابل ہونے کی خاطر ٹیکس ادا کریں۔ سردست اگر یہ نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدائی تا ثانوی اور اعلیٰ جامعاتی ساری تعلیم کو مفت کر دیا جائے تو کم از کم ابتدائی تعلیم تو ضرور مفت ہونی چاہئے اور ہر لڑکے اور لڑکی پر ۵، ۶ برس کی عمر سے ۱۲، ۱۳ برس کی عمر تک لازمی ہونی چاہئے۔ اگر کسی وجہ سے حکومت یہ کام نہ کر سکے تو مرکزی تنظیموں کو چاہئے کہ اس کا بیڑا اٹھائیں اور خود اپنی فلاح و بہبود کی خاطر اس کی طرف متوجہ ہوں۔

(ب)

ثانوی (سکنڈری) تعلیم

مدت تعلیم ۵ سال۔ عمر (۱۲-۱۳ تا ۱۷-۱۸ سال)
اس منزل میں متعلمین کو ذیل کے مضامین کی تعلیم دی جائے گی۔

۱) اردو
۲) انگریزی
۳) دینیات
۴) طبیعی علوم کے مبادیات (ریاضی، طبیعیات، کیمیا)
۵) حیاتی علوم کے مبادیات (بشمول علوم اعضا و اصول حفظان صحت)
۶) عمرانی علوم کے مبادیات (تاریخ عالم وجغرافیہ۔ شہریت کے اصول)
۷) زبان دوم (عربی، فارسی، سنسکرت، اور شہری یا کوئی صوبجاتی زبان) یہ اختیاری مضمون ہوگا۔
۸) ورزش جسمانی
۹) کارخانہ میں مشینوں کے استعمال کی تربیت۔

نوٹ:۔ ماہرین کی مختلف کمیٹیاں ان مضمونوں کا تفصیلی نصاب تیار کر سکتی ہیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ ثانوی منزل پر تعلیم میں مضامین کی تخصیص

داخل کرنا بہت قبل از وقت ہے اس کے متعلق گزشتہ صفحات میں کافی
بحث کی جا چکی ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ ہر متعلم کو ثانوی منزل
کے پورے پانچ سال تمام مذکورۂ بالا مضامین ایک مناسب حد تک
پڑھائے جانے چاہئیں۔ یہ ایک قلیل ترین معیار ہے اور اس قدر علم ہر
مہذب انسان کو ہونا چاہئے۔ معاشرے کے موجودہ نظام میں یہ یقینی
ہے کہ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد ثانوی منزل کے ختم پر اپنی تعلیم
ختم کردے گی اور کسی پیشہ یا حرفہ کی طرف رجوع ہوگی صرف معدودے
چند یعنی شاید پندرہ بیس فی صد نوجوان ہی اعلیٰ جامعاتی تعلیم میں داخل
ہوں گے اس لئے ثانوی تعلیم کا نصاب اس طرح مستقل بذات ہو کہ وہ
ایک وحدت کا کام دے سکے اور جو لوگ اس منزل پر اپنی تعلیم ختم کردیں
ان کی جسمانی، ذہنی، روحانی اور جماعتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ایک
حد تک کافی تربیت ہو جائے۔ اس عام ثانوی تعلیم کے بعد جو سیول
ایجوکیشن کے تمام ضروری اور اہم اجزاء پر مشتمل ہے یہ نوجوان اپنے پیشہ
اور حرفہ کی تعلیم و تربیت کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اور دو تین سال
تک اس پیشہ کی تربیت حاصل کرنے کے بعد انیس بیس سال کی عمر میں
عملی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں اس زمانے
میں جب کہ ہر فن، ہنر اور پیشہ میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے کسی فرد بشر
کا اپنی عمر کے ابتدائی بیس سال تعلیم و تربیت میں صرف کرنا کچھ بہت
زیادہ نہیں ہے۔ اس سے کم مدت ایک فرد کو مطمئن انسان اور اچھا

پیشہ ور بنانے کے لئے کافی ہو ہی نہیں سکتی۔

میں نے ثانوی منزل میں تمام طلبہ کے لئے مشینوں کے استعمال سے واقفیت حاصل کرنے کو لازمی قرار دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے نوجوانوں اور نئی نسلوں کو مشینوں سے مانوس کرنے کے لئے یہ تربیت بہت ضروری ہے۔ ان شہروں میں جہاں کوئی نہ کوئی کارخانہ موجود ہے طلبہ کو ہفتہ میں دو تین مرتبہ ایک دو گھنٹوں کے لئے کسی کارخانے کو لے جا کر مشینوں کے استعمال سے واقف کرایا جا سکتا ہے اور معمولی مشینوں کے پرزوں کو علیحدہ کرنے اور جوڑنے کی مشق کرائی جا سکتی ہے اور اسی کے ساتھ انہیں ان مشینوں کو درست کرنا سکھایا جا سکتا ہے۔ یہ کام مدرسوں کے اساتذہ اور کارخانوں کے مالکوں اور ماہروں کے اشتراکِ عمل سے بخوبی انجام پا سکتا ہے۔ بلکہ اگر ممکن ہو تو تعلیم کی ابتدائی منزل کے آخری سالوں میں ہی مشینوں کی تربیت کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ چھوٹے شہروں کے اور ان قصبوں کے طلبہ کو جہاں کوئی کارخانہ نہیں ہے تعطیلات میں کسی قریب کے بڑے شہر میں لے جانے کا انتظام کرنا چاہئے تاکہ وہ ان بڑے شہروں کے کارخانوں میں تربیت پا سکیں اور مشینوں کے استعمال سے مانوس ہو سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان قدیم زمانے سے زراعتی ملک رہا ہے اور اب تک بھی یہاں کے باشندوں کا سب سے بڑا مشغلہ یہی ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہاں معدنیات یا ان خام اشیاء کی کمی ہے جو صنعت وحرفت کو فروغ دینے کے لئے ضروری ہیں۔ گزشتہ تین چار سال میں یہاں کی

ممکنہ صنعتوں کا کسی قدر اندازہ ہو چکا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان اب بھی ارتقاء کے قبل صنعتی زمانے میں پڑا ہوا ہے حالانکہ مغربی ممالک صنعتی انقلاب کے بعد سے صنعت و حرفت میں برابر ترقی کرتے چلے جارہے ہیں۔ چونکہ جدید تمدن کی بناء ہی صنعت و حرفت پر ہے اس لئے ترقی کی دوڑ میں ہندوستان والے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ گئے۔

دنیا کی موجودہ صورتِ حال کا لحاظ کرتے ہوئے یہ امر یقینی ہے کہ کوئی قوم جو صنعت و حرفت سے گریز کرتی ہے اس کا بین الاقوامی کشمکش میں زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اسی لئے اہل ملک کے سامنے وقت کا سب سے اہم مسئلہ یہی ہے اور ہونا چاہئے کہ ملک کو صنعتی ملک کس طرح بنائیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ہم کو سائنسوں اور خصوصاً عملی اور میکانی سائنسوں میں بڑی مہارت حاصل کرنی پڑے گی اور اس لئے میں اس اصول پر زور دے رہا ہوں کہ مدرسوں کی تعلیم کے زمانے ہی میں نوجوانوں کو مشینوں سے مانوس کرنا چاہئے تاکہ آگے چل کر عملی سائنسوں کی مہارت حاصل کرسکیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ثانوی منزل کے دوران میں دو یا تین سال کے بعد ہی یعنی متعلم کی عمر کے چودھویں پندھویں سال ہی میں اس کو کسی ایک خاص مضمون یا پیشہ کی طرف لگا دینا چاہئے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس طرح بہت قبل از وقت تخصیص سے تعلیم کے بعض تہذیبی پہلو تشنہ رہ جائیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس نظری بحث سے اس کا تصفیہ

تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے لئے طویل المیعاد تجربوں اور مشاہدوں کی اور مختلف ماہروں اور عوام کی رائے کی ضرورت ہے کہ ثانوی منزل کے پورے پانچ سال تک تمام متعلمین کو سارے مضامین کی ایک مشترکہ معیار تک تعلیم دی جائے یا آخری دو تین سال کسی خاص مضمون یا پیشہ کی تخصیص کردی جائے!

بہر حال اگر تخصیص کو اس منزل پر مفید ہی سمجھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ چند ضروری مضامین جیسے اُردو، انگریزی، دینیات اور ورزش جسمانی پورے پانچ سال تک تمام متعلمین کے لئے لازمی اور مشترک رہیں اور آخر کے دو سال میں کوئی زبان و ادب یا طبیعی، حیاتی اور عمرانی علوم میں سے کوئی ایک شاخ مثلاً حیاتی علوم یا کوئی پیشہ اور حرفہ مثلاً زراعت یا پیشہ معلمی کو منتخب کیا جائے اور اس کی زیادہ تفصیلی تعلیم و تربیت حاصل کی جائے۔ لیکن ثانوی تعلیم کے ختم پر اس پیشہ کی مزید عملی تربیت دو سال تک یعنی انیس برس کی عمر تک حاصل کرنا بہر حال ضروری رہے گا کسی میکانک، معلم یا اہلکار کو ثانوی تعلیم اور بعد کی دو سالہ تربیت کامیابی کے ساتھ ختم کئے بغیر کسی قسم کی سرکاری یا خانگی ملازمت میں داخل نہیں کرنا چاہئے۔

اسی طرح لڑکیوں کے لئے ان آخری دو سال میں امور خانہ داری کی تربیت دی جا سکتی ہے۔

(ج)

اعلیٰ تعلیم

اعلیٰ تعلیم سے مراد جامعاتی یا ٹکنیکل اور پیشہ ورانہ کالجوں کی تعلیم ہے جو ثانوی منزل کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اوپر کی تشریح سے واضح ہو چکا ہوگا کہ متعلم اعلیٰ تعلیم کی سرحد میں کم از کم ۱۷ - ۱۸ برس کی عمر میں داخل ہوگا اور ۲۰ - ۲۱ برس سے کم عمر میں وہ بی۔ اے نہیں کر سکے گا۔ ہندوستان کی اکثر جامعات میں یہ طریقہ رائج ہے کہ طلبہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں میٹریکیولیشن اور اٹھارہ انیس برس کی عمر میں بی۔ اے ہو جاتے ہیں اور خود کو فارغ التحصیل سمجھنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان نوعمر گریجوئیٹوں سے اس ذہنی پختگی کی توقع نہیں ہوسکتی جو ایک ڈگری یافتہ شخص میں ہونی چاہیے۔ عمر کی اسی کمی کے باعث ہماری جامعات کے بی۔ اے کا معیار مغربی جامعات کے بی۔ اے سے کسی قدر پست ہوتا ہے۔ اگر عمر کا لحاظ رکھا جائے تو یہ یقینی ہے کہ ہندوستان کا اوسط متعلم کسی دوسرے ملک کے اوسط متعلم سے کسی طرح کم نہیں لیکن کم عمر میں ان کو بی۔ اے ہو جانے کا موقع دینے سے یہ نوجوان اکثر اس نفسیاتی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ چونکہ گراجویٹ ہیں اس لئے سب کچھ جانتے ہیں۔ ان کی نظر اس پر نہیں رہتی کہ انھیں اس کم عمر میں گراجویٹ ہونے کا موقع ملا ہی اس وجہ سے ہے کہ بی۔ اے کا معیار مقابلتہً پست ہے۔

اسی لئے میں ثانوی تعلیم کو ۱۷ - ۱۸ برس کی عمر تک جاری رکھنے اور اعلیٰ تعلیم کو ۱۸ برس کی عمر میں شروع کرنے کی تجویز پیش کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ثانوی تعلیم کے بعد جامعات میں کسی انٹرمیڈیٹ امتحان کی ضرورت نہیں بلکہ بی۔ اے کا تین سالہ نصاب رائج کرنا کافی ہے۔ جیسا کہ بعض جامعات میں اب بھی کیا جا رہا ہے۔

اس طرح جامعاتی تعلیم کی مختلف منزلیں حسب ذیل ہوں گی۔

بی۔ اے مدت تعلیم ۳ سال۔ عمر (۱۷ - ۱۸ تا ۲۰ - ۲۱)

ایم۔ اے مدت تعلیم ۲ سال۔ عمر (۲۰ - ۲۱ تا ۲۲ - ۲۳)

پی ایچ ڈی مدت تعلیم ۳ سال۔ عمر (۲۲ - ۲۳ تا ۲۵ - ۲۶)

انجینیری، طب، زراعت، تجارت، قانون وغیرہ پیشوں کا ڈگری کورس } مدت تعلیم ۵ سال عمر (۱۷ - ۱۸ تا ۲۲ - ۲۳)

میں تو اس کو ایک بدیہی حقیقت کے طور پر مان لے رہا ہوں کہ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تینوں منزلوں کی ساری تعلیم اپنی زبان اردو کے ذریعہ سے دی جائے گی۔ یہ امر اب اس قدر واضح ہو چکا ہے کہ اس کے متعلق کسی مزید استدلال کی ضرورت نہیں۔

بی۔ اے مدت تعلیم ۳ سال عمر (۱۷ - ۱۸ تا ۲۰ - ۲۱ سال)

اس میں منطق اور علمیات (Theory of Knowledge) فلسفہ

مذہب واخلاق اور انگریزی ہر طالب علم کے لئے لازمی ہوں گی اور ان کا امتحان دوسرے سال کے ختم پر لیا جائے گا۔

اختیاری مضامین میں سے ایک مضمون بطور اصل مضمون کے اور دو مضامین بطور ذیلی مضمونوں کے لینے ہوں گے۔ ان اختیاری مضامین کے انتخاب کے وقت علوم کی اس ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو ہیں نے پیش کی ہے۔ مثلاً عمرانی علوم کے ہر متعلم کے لئے لازمی ہوگا کہ نفسیات بطور ایک ذیلی مضمون کے لے۔ اسی طرح نفسیات بطور اصل مضمون لینے والے متعلم کے لئے لازم ہوگا کہ حیاتیات بطور ایک ذیلی مضمون کے لے۔

مثال کے طور پر یہاں چند اصل اور ذیلی مضامین کے اجتماعات درج کئے جاتے ہیں :-

اصل مضمون	ذیلی مضمون (۱)	ذیلی مضمون (۲)
۱) ریاضی	منطق	طبیعیات
۲) طبیعیات	ریاضی	کیمیا
۳) کیمیا	طبیعیات	ریاضی یا حیاتیات
۴) حیاتیات	طبیعیات	کیمیا
۵) عمرانیات	نفسیات	معاشیات
٦) معاشیات	نفسیات	عمرانیات

۷) تاریخ نفسیات سیاسیات
۸) کوئی زبان و ادب دوسری ملحقہ زبان و ادب لسانیات و صوتیات
وغیرہ۔

---

(۱۱)

جامعہ کے شعبہ جات (FACULTIES)

ہندوستانی جامعات میں شعبوں (Faculties) کی تقسیم بالکل غیر اصول اور ناموزوں ہے۔ مثلاً ایک شعبہ فنون (Art Faculty) ہی کو لیجئے اس میں متعدد زبانیں شامل ہیں اور ان کے علاوہ وہ عمرانیات، معاشیات، تاریخ، فلسفہ وغیرہ تمام مختلف مضمون شامل ہیں۔ دوسری طرف صرف ایک ہی مضمون قانون کے لئے پورا ایک شعبہ (Faculty) بنایا جاتا ہے۔ اس طرح ریاضی، طبیعیات، نباتیات، حیوانیات ارضیات وغیرہ جیسے وسیع طبیعی اور حیاتی علوم کے مضمونوں کا تعلق صرف ایک ہی شعبۂ سائنس (Science Faculty) سے ہوتا ہے لیکن انجنیری کے مضمون کے لئے جو دراصل طبیعی علوم کا ایک جزو ہے ایک علیحدہ شعبہ ہوتا ہے اور اسی طرح طب کے مضمون کے لئے جو حیاتی علوم کا ایک جزو ہے ایک علیحدہ شعبہ ہوتا ہے اگر کہا جائے کہ انجنیری اور طب کی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ریاضی اور طبیعیات کی بھی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں۔

اس لئے میری تجویز ہے کہ مختلف شعبوں (Faculties) کی حسب ذیل ترتیب دی جائے۔

۱) دینیات۔

۲) زبان و ادب

۳) طبیعی علوم

ریاضی، طبیعیات، کیمیا، ارضیات، ہیئت، جغرافیہ، انجنیری

۴) حیاتی علوم

نباتیات، حیوانیات، زراعت، طب، نفسیات

۵) عمرانی علوم

عمرانیات، معاشیات، تاریخ، سیاسیات، تجارت، قانون۔

۶) منطق، فلسفہ، اخلاق۔

۷) فن تعلیم (تدریسیات)

اگر کسی وجہ سے ناگزیر ہی سمجھا جائے تو ان ۷ شعبوں کے علاوہ انجنیری، زراعت، طب، تجارت اور قانون کے لئے پانچ علیحدہ شعبے (Faculties) قائم کئے جا سکتے ہیں۔

ان پیشہ ورانہ شعبوں یعنی انجنیری، طب، اور قانون وغیرہ میں شریک ہونے والے طلبہ کی تعلیم ثانوی منزل کے اختتام پر بی۔ اے کے متماثل شروع کی جا سکتی ہے اور اس کے لئے بی۔ اے کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔ ان مضامین کی تعلیم اور عملی تربیت کے لئے کم از کم پانچ سال معین ہونا چاہئے اور ان مضامین کے طیلسانیوں کی حیثیت دوسرے علمی مضامین کے ایم اے سے کم نہیں ہونی چاہئے۔ ان مضمونوں کا نصاب بناتے وقت اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ان علوم کو

کما حقہ، سمجھنے اور تشکیل دینے کے لئے چند دوسرے علوم کی واقفیت ناگزیر ہے۔ مثلاً انجنیری کے لئے ریاضی اور طبیعیات کی، زراعت کے لئے نباتیات اور کیمیا کی، طب کے لئے حیاتیات کی، تجارت کے لئے معاشیات کی اور قانون کے لئے عمرانیات کی واقفیت لازمی ہے۔ اس لئے ابتدائی دو تین سال تک یہ ضروری مضامین بھی اچھی طرح پڑھائے جانے چاہئیں۔

---

(۱۲)

طالب علم اور عملی سیاسیات

عام طور پر ذہنی زندگی جسمانی زندگی کے متوازی اور ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ مستثنیات سے قطع نظر جوانوں کے ذہن بھی جوان اور ترقی پذیر ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر نئی تحریک کے علمبردار جواں سال افراد ہی ہوتے ہیں اور ارتقا کی ہر نئی منزل پر انہی کے نشانات ملتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نوع انسان کے مستقبل کا دارومدار نوجوانوں ہی پر ہے۔ یہ حقیقت جو تاریخ کے ہر دور میں نمایاں نظر آتی ہے موجودہ زمانے میں اور بھی زیادہ واضح اور روشن ہے۔ ان عظیم جنگوں میں جو مہلک سے مہلک تر ہوتی جا رہی ہیں تہذیب و تمدن کے اور دوسرے آثار کے ساتھ علوم و فنون کی نشانیاں بھی معرض خطر میں پڑتی جا رہی ہیں۔ زمانے کے دست و برد سے وہ چند ہستیاں بھی محفوظ نہیں رہتیں جو علم و فن اور نظر و خبر کی حامل ہوتی ہیں اور جن کی ذات تہذیب و تمدن کی ضامن ہوتی ہے۔ جب یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے تو نوجوانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ علوم و فنون کے اس گنجینے کو اپنے سینے میں محفوظ رکھیں اور تہذیب و تمدن کی شمع کو ہمیشہ روشن رکھنے کی کوشش کریں۔ سن رسیدہ لوگ ان ہنگاموں کی راست زد میں ہونے کے علاوہ قدرتاً قبر میں

پیر لٹکائے ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اگر یہ دانائے راز معدوم ہو جائیں تو اندیشہ ہے کہ فطرت کے جن اسرار کو انسان نے ہزاروں سال کی کشمکش کے دوران میں منکشف کیا ہے ان کا کوئی محرم نہ رہے اور قدرت کی جن طاقتوں کو مسخر کرنے کے لئے ہمارے قابل احترام بزرگوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنی جانیں لڑا دی ہیں ان کا استعمال بھی کسی کو معلوم نہ ہو۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اس کا نتیجہ ہوگا کہ انسان اسی ابتدائی زندگی کی طرف لوٹ جائیں جو شاید حیوانوں کی زندگی سے بہت کم فرق رکھتی ہے۔ ارتقا کا تسلسل صرف اسی طرح باقی رہ سکتا ہے کہ نوجوان اس بار امانت کو اٹھائیں، اس کو اپنے خون جگر سے سینچیں اور اس میں اضافہ کریں انہی معنوں میں کہا جاتا ہے کہ آج کے نوجوان کل کے شہری ہوتے ہیں اور اسی لئے میرے نزدیک قوم کی ہیئتِ اجتماعی میں نوجوانوں کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی جماعت اور کسی قوم پر خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کی حفاظت کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اس طرح آئندہ نسلوں کے وجود اور بقا کا سامان کرتی ہے۔ لیکن میری نظر میں آئندہ نسلوں کا یہ وجود محض ہی کافی نہیں اگر اسی کے ساتھ زندگی کی وہ اقدار باقی نہ رہیں جو زندگی کو واقعی قابلِ زیست بناتی ہیں۔ انہی اقدار کو باقی رکھنا اور ان میں اضافہ کرنا نوجوانوں کی زندگی کا مقصود ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم ذمہ داری سے کماحقہٗ عہدہ برا ہونا کچھ آسان کام نہیں ہے، انسانوں کی زندگی اب ویسی سادہ نہیں رہی جیسی گزشتہ زمانوں میں تھی۔ اب زمانہ ماہرین اور محققین کا ہے۔

اور زندگی کے ہر شعبے میں صرف وہی افراد کارآمد ہوتے ہیں جنھوں نے اس کے لئے تربیت حاصل کی ہے، اور جو اس میں مہارت پیدا کر چکے ہوں۔ جن پیشوں کو غلطی سے حقیر سمجھا جاتا ہے، جیسے مزدوری یا سنگ تراشی، ان میں بھی کسی غیر تربیت یافتہ آدمی کی مانگ نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو کچھ زیادہ قدر نہیں کی جاتی۔ غرض یہ کہ بغیر خاص تیاری اور تربیت کے کوئی شخص زندگی میں داخل نہیں ہو سکتا۔ زندگی سے میری مراد محض (جینا) نہیں ہے کہ ہم دست و پا شکستہ دوسروں کے محتاج موت کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے ہوں اور سوسائٹی اور جماعت کے لئے وبال جان بن جائیں۔ بلکہ ہر فرد کی زندگی ایسی ہونی چاہئے کہ اس سے جماعت کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچے اور یہ بات بغیر خاص تیاری اور تربیت کے حاصل نہیں ہوتی۔ انجینیری اور ڈاکٹری سے لے کر تعلقداری، شاعری، اور لیڈری تک ہر کام کے لئے تربیت کی ضرورت ہے۔ ادھوری اور ناقص تربیت بالکل تربیت نہ پانے سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ سائنس کے کسی مسئلہ کو ادھا ثابت کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں مسئلہ بہرحال ناقابل فہم رہے گا۔ کسی مشین کو آدھا بنانا یا نہ بنانا دونوں برابر ہیں کیونکہ مشین بہرحال نہیں چلے گی۔ غرض اس دنیا کی بہت سی خرابیاں اس وجہ سے ہیں کہ اکثر کام ناتربیت یافتہ یا نیم تربیت یافتہ لوگوں کے ہاتھ میں ہیں اور یہ خرابیاں اس وقت تک باقی رہیں گی جب تک اس اصول کو مان کر اس پر سختی کے ساتھ عمل نہ کیا جائے گا کہ ہر فرد کی صلاحیتوں کے لئے اسے بہترین تربیت کا موقع دیا جائے اور ہر کام اسی شخص سے لیا جائے جو

اس کو بہترین طور پر انجام دے سکتا ہو۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہر فرد کو انفرادی
و اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لیے کس قدر تیاریاں کرنی پڑتی
ہیں یہ صحیح ہے کہ زندگی کے ان تمام شعبوں اور پہلوؤں کے لیے مکمل تربیت
ابتدائی عمر ہی میں نہیں ہو سکتی لیکن یہ بھی ضرور صحیح ہے کہ یہ تربیت اور تیاری
بڑی حد تک ایام جوانی میں ہونی چاہیئے۔ یہ زمانہ بہت مختصر اور محدود
ہوتا ہے۔ اس تھوڑے سے عرصے میں ایک نوجوان کو جسمانی، ذہنی،
روحانی، اور جماعتی ہر قسم کی زندگی کے لیئے بڑی حد تک تیاری کرنی
ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا لازم نہیں کہ نوجوان طالب علم اپنے
وقت کے ہر لمحے کا محاسبہ کریں اور اپنی باشعور زندگی کی ہر گھڑی کو
ان مختلف تیاریوں کے لئے وقف کر دیں۔

ہر نوجوان کو سوسائٹی سے اس مطالبہ کا حق ہے کہ اس کی زندگی
کے مختلف پہلوؤں کے نشوونما اور تکمیل کے لئے تعلیم و تربیت کے مساوی
موقعے دیے جائیں اور ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ جسمانی زندگی کی
بقا کے لئے روزگار فراہم کیا جائے۔ ذہن کی تربیت کے لئے مدرسے،
کتاب گھر اور تجربہ خانے مہیا کئے جائیں اور روحانی زندگی کے اظہار
اور تکمیل کے لئے مواقع اور ذریعے بھی بہم پہنچائے جائیں۔ یہ ہر فرد بشر
کے پیدائشی حقوق ہیں لیکن اس دنیا میں حقوق کے مقابل فرائض بھی
ہیں جو ہر فرد پر عائد ہوتے ہیں۔ اس لیئے جماعت کو بھی نوجوانوں سے
اس مطالبے کا حق ہونا چاہیئے کہ جب تک ان کی تعلیم و تربیت مکمل یا ختم

نہ ہو جائے وہ دوسرے مشاغل میں حصہ لے کر اپنے وقت کو ضائع نہ کریں۔
کیونکہ اس طرح ان کی تعلیم و تربیت نامکمل رہ جائے گی اور اس سے
نہ صرف ان کی ذات ہی متاثر ہو گی بلکہ وہ جماعت کے فرائض بھی پوری
طرح سے ادا نہ کر سکیں گے۔ اگر نوجوان طالب علم غیر متعلقہ ہنگاموں
میں حصہ لے کر تربیت کے اس موقع کو کھو بیٹھیں اور اس طرح ان کے
وجود سے جماعت کو آئندہ فائدہ پہنچنے کے امکانات کم ہو جائیں تو
یہ نہ صرف اس جماعت کا بلکہ ساری دنیا کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔
طالب علموں کا جس قدر خفیف سے خفیف وقت بھی دنیا کے جھگڑوں،
عملی اور سیاسی قضیوں میں صرف ہو گا وہ ان کی تعلیم و تربیت کو ناقص
رکھے گا اور اسی تناسب سے ان کی افادیت میں کمی ہو جائے گی۔
جہاں تک مجھے معلوم ہے اکثر بزرگ انسان اور سمجھ دار قائدین اس
امر میں متفق ہیں کہ نوجوان طالب علموں کو عملی سیاست سے اور دنیا کے
جھگڑوں سے دور ہی رکھا جائے۔ افسوس ہے کہ بعض لوگ یا بعض
گروہ جن سے صحیح رہنمائی کی توقع کی جا سکتی ہے مختلف وجوہ کی بنا پر
طالب علموں کو عملی سیاست کی آگ میں جھونک دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں
دیکھتے کہ اس طرح آخر کار انہی کو سب سے زیادہ نقصان پہونچتا ہے
اور ترقی کی شاہراہ میں خود ان ہی کی جماعت سب سے پیچھے رہ جاتی
ہے کیونکہ ان کے نوجوان ترقی کے لئے کامل طور پر تربیت یافتہ نہیں
ہوتے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جو لوگ ابھی تیرنے کی مشق

کر رہے ہوں اور نو سیکھ ہوں انھیں متلاطم سمندر میں ڈھکیل دیا جائے تاکہ وہ بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو ساحل مقصود تک پہنچا دیں۔ ظاہر ہے کہ کشتی کو تو وہ کیا بچائیں گے خود اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے۔ زیر تعلیم اور زیر تربیت نوجوانوں کو وقتیہ مقصد براری کی خاطر عملی سیاست کے متلاطم سمندر میں ڈھکیل دینا تہذیب اور تمدن کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔

ضرورت اس کی ہے کہ مدرسوں اور کالجوں کے طلبہ کو سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے سے باز رکھا جائے۔ جب تک وہ تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں اس وقت تک وہ گویا ایک اعتکاف کی حالت میں ہیں اور کسی قسم کے دوسرے مشاغل ان کے لئے جائز نہیں۔ ان کی زندگیاں ایک طلسمی احاطہ میں محصور ہونی چاہئیں جہاں سے وہ دنیا اور اس کے حالات کا مشاہدہ کر سکیں، واقعات سے باخبر رہیں اور ان سے صحیح نتیجے اخذ کر سکیں لیکن ان تحریکوں اور ہنگاموں میں عملی حصہ نہ لیں۔

اس پر تو غور کیجیے کہ عملی دنیا سے نوجوان کچھ ہمیشہ کے لئے یا ایک عرصۂ دراز کے لئے تو محروم نہیں کئے جا رہے ہیں۔ آخر یہ ساری تیاری یا یہ تمام تعلیم و تربیت اسی لئے تو ہے کہ وہ اس کے ختم پر عملی دنیا میں اچھی طرح حصہ لے سکیں۔ ان چند سالوں میں جب کہ وہ ابھی تعلیم گاہوں اور تربیت گاہوں میں اپنی صلاحیتوں کی تکمیل کر رہے ہیں آخر زمین اور آسمان کے طبقے تو نہیں الٹ جائیں گے یا دنیا جنت کی طرح ہر حیثیت سے مکمل تو نہیں ہو جائے گی کہ اس کے بعد پھر نوجوانوں کی قوت عمل کے لئے

کوئی جولاں گاہ باقی رہے۔ ابھی ایک عرصۂ دراز تک اس دنیا میں انسانوں کا وجود رہے گا، خیر و شر کی کشمکش رہے گی، حق و باطل کی جنگ رہے گی اور افراد اور جماعتوں کے لئے عمل اور ترقی کے امکانات رہیں گے۔ غرض نوجوانوں کو عمل کے لئے ہمیشہ موقع باقی رہے گا اور ان کی باری بھی ضرور آئے گی۔ ہماری تو یہی خواہش ہے کہ جب ان کی باری آئے اور ان کو موقع ملے تو وہ ہر طرح تیار رہیں اگر وہ آج ہی اپنی نیم بیدار صلاحیتوں کو ضائع کر دیں تو کل ضرورت کے وقت وہ کسی کام کے نہ رہیں گے۔

اس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے غور کیجئے۔ سب جانتے ہیں کہ موجودہ حالات سے نبٹنے اور آج کے جھگڑوں کو چکانے میں جماعت کے کتنے افراد سرگرم ہیں۔ ہر ملک کے مدرسوں کالجوں اور تربیت گاہوں میں تعلیم پانے والے نوجوانوں کی تعداد قوم کی مجموعی تعداد کا ایک بہت قلیل حصہ ہوتی ہے۔ اس قلیل تعداد کے علاوہ باقی تمام افراد عملی زندگی کی کشمکش میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان باقی افراد نے اپنی تعلیم و تربیت ختم کر لی ہے اور عملی زندگی کے لئے ایک حد تک تیار ہیں۔ فارغ التحصیل افراد کی یہ کثیر تعداد عملی زندگی کے مرحلوں کو طے کرنے کے یا تو قابل ہے یا قابل نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اس کشمکش میں کامیابی حاصل کرنے کے قابل ہیں تو پھر نوجوان طالب علموں کی قربانی نہ صرف قومی نقصان ہے بلکہ غیر ضروری اور بے سود بھی ہے۔ اس کے برخلاف اگر یہ سن رسیدہ افراد باوجود کثیر تعداد

کے اور اس تربیت اور تیاری کے زندگی کے جھگڑوں سے نپٹنے کے قابل نہ ہوں تو نوجوان طالب علموں کی قلیل تعداد جو چند نیم تربیت یافتہ یا ناتربیت یافتہ افراد پر مشتمل ہے کس طرح موثر ہو سکتی ہے اور جماعت کی جدوجہد کو کیسے کامیاب بنا سکتی ہے؟ غرض دونوں صورتوں میں ظاہر ہے کہ نوجوان طالب علموں کی زندگیوں کو تباہ کرنے اور قومی زندگی اور ارتقا کو خطرہ میں ڈالنے کے باوجود بھی کوئی قابل لحاظ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ نوجوان متعلم اس دنیاوی جنجال میں نہ پڑیں اور اپنی تعلیم و تربیت میں منہمک رہیں تاکہ پوری تیاری کے بعد وہ اس دنیا کو بہتر طریقے پر چلانے کے قابل ہوں۔

اس عالمگیر جنگ کے دوران میں بھی ہر ملک اپنے تعلیمی اداروں متعلموں اور معلموں کی حفاظت کی تدبیریں اختیار کر رہا ہے کیونکہ جنگ کے بعد جو نظامِ نو قایم کرنا مقصود ہے اس کے چلانے والے بہرحال یہی نوجوان متعلم ہوں گے۔ نئی نسلوں اور نوجوانوں کی حفاظت اور تربیت کے بغیر یہ نظامِ نو ایک بے معنی سی چیز رہ جاتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جنگ کا اثر دوسرے اداروں پر پڑے یا نہ پڑے تعلیم و تربیت کے اداروں پر ہرگز نہیں پڑنا چاہئے اور اس لئے قومی تعمیر کے اس اہم ترین شعبے کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچنے دینا چاہئے۔ اگر قوم اور بنی نوع کی حفاظت، بقا اور ترقی مقصود ہو تو پھر نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کے طریقوں کی فوری اصلاح اور ایک منظم لائحہ عمل سب سے زیادہ اہمیت

رکھتے ہیں اور ہر جماعت کو سب سے پہلے اسی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔